وَلٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ

شرکت ادبیہ امرتسر کے سلسلۂ کتب تصوف کا پہلا نمبر

مکتوبات امام ربانی اردو

مشرح

حصہ اوّل معہ

سوانح عمری حضرت مجدد الف ثانی

مؤلفہ

فضیلت مآب جناب مولانا مولوی عبدالرحیم صاحب

منشی فاضل مولوی فاضل

اسسٹنٹ ایڈیٹر اخبار وکیل امرتسر

۱۳۱۲ھ ۱۹۱۲ء

مطبوعہ روز بازار اسٹیم پریس امرتسر باہتمام شیخ عبدالعزیز

فہرست مطالب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ صفیہ ورسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین اما بعد (۱) مکتوبات عالیہ امام ربانی جس اعلیٰ پایہ کی کتاب ہے، اور جن حقائق ومعارف تصوف پر یہ کتاب مشتمل ہے محتاج تعریف وتوصیف نہیں۔ صدہا اولیاء عظام اور علماء کرام اس کے دریائے معارف سے سیراب ہوتے رہے ہیں لیکن چونکہ یہ مکتوبات دقیق فارسی میں لکھے گئے ہیں اکثر کم استعداد اردو خوان اصحاب استفادہ کرنے سے محروم تھے اور مدت سے یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ ان کو اردو کا لباس پہنایا جائے چنانچہ آج خدا کے فضل سے یہ آرزو پوری ہوئی ۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست + آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

(۲) ترجمہ حتی الامکان نہایت سلیس اور بامحاورہ اردو میں کیا گیا ہے۔ الفاظ کا تقید نہیں کیا لیکن مفہوم میں کسی قسم کا تصرف نہیں کیا گیا۔ اگر کسی موقعہ پر اپنی طرف سے کوئی چھوٹا سا فقرہ بڑھایا گیا ہے تو اس کو خطوط وحدانی کے اندر لکھا ہے +

(۳) توضیح مطالب کے لئے جابجا اپنے خیال کے مطابق تدقیق کے ساتھ مدلل اور ضروری حاشیے لگا دیئے گئے ہیں جنکو امید ہے کہ ناظرین پڑھکر محظوظ ہوں گے +

(۴) اصل کتاب کی ابتدا میں وہ عرائض درج ہیں جو امام صاحب نے اپنے پیر بزرگوار کی خدمت میں لکھے تھے۔ مترجم نے ان کو یہاں سے حذف کر کے ان کی بجائے امام صاحب کا مختصر مگر جامع اور مکمل تذکرہ (سوانح عمری) لکھکر ہدیۂ ناظرین کیا ہے جسکا معلوم کرنا ناظرین مکتوبات کے لئے نہایت ضروری اور سب سے مقدم سمجھا گیا ہے۔ عرائض کا ترجمہ مکتوبات کے آخری حصہ کے اخیر میں بطور ضمیمہ شامل کر دیا جائیگا انشاء اللہ تعالیٰ۔ امید ہے کہ ناظرین اس قدر خفیف تقدیم وتاخیر کو جس میں ایک بھاری فائدہ مدنظر رکھا گیا ہے بخوشی خاطر گوارا کر لیں گے +

(۵) مندرجہ بالا ضرورت کی وجہ سے مکتوبوں کا نمبر بدلنا پڑا لیکن ساتھ ہی خطوط وحدانی کے اندر ہندسہ میں فارسی مکتوبات کا اصل نمبر بھی دیا گیا ہے تاکہ اگر کسی صاحب کو اصل مکتوب دیکھنا ہو تو فوراً اصل کتاب سے اسکو تلاش کر سکے۔ اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ ۔

کوئی انسان غلطی سے محفوظ نہیں رہ سکتا اسلئے اگر مترجم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو تو ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ معاف فرما کر اسے مطلع فرمائیں کہ ممنونیت کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے طبع دوم میں اس کی اصلاح کیجائیگی۔ اخیر میں التماس ہے کہ مستفید ہو کر مترجم اور ناشر کتاب ہذا کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں۔ والسلام علےٰ من اتبع الہدےٰ ۔

کتبہٗ عبد الرحیم۔ مقام امرتسر ۔ ۱۷ جمادی الآخرہ سنہ ۱۳۳۰ ہجری

۷۸۶

آپکا اسم گرامی شیخ احمد فاروقی اور مولد و مسکن سرہند کا قصبہ ہے۔ آپکا سلسلہ نسب ۲۸ واسطوں سے خلیفہ ثانی امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ تک پہونچتا ہے اور اسی وجہ سے ان کو فاروقی کہتے ہیں۔ آپکے اسلاف میں دو بزرگوار بڑے نامور اور صاحب ولایت گذرے ہیں:۔

(۱) سلطان شہاب الدین علی جو فرخ شاہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ فرخ شاہ مذکور طریقۂ صوفیہ کے اختیار کرنے سے پہلے والئ کابل تھے اور کئی دفعہ فاتحانہ حیثیت سے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے بالآخر عنایت الٰہی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر زمرۂ اہل تصوف میں داخل کیا۔ سلوک میں درجۂ کمال حاصل کر کے تکمیل میں مشغول ہوئے اور ایک عالم کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کیا ۔

(۲) شیخ رفیع الدین المعروف امام زمان۔ یہ حضرت مجدد کے جد ششم ہیں۔ جامع علوم ظاہری و باطنی تھے۔ حضرت سید جلال بخاری سے جو ایک مشہور صاحب طریقت ہیں فیضیاب ہوئے جب حضرت مخدوم بخارا سے کابل میں تشریف لائے تو شیخ رفیع الدین کو بھی ساتھ لیکر ہندوستان کا قصد کیا۔ سرہند سے پانچ کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے وہاں قیام کیا تو گاؤں والوں نے خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ آپ دہلی میں جا کر از راہ مہربانی پادشاہ سے سفارش کیجیگا کہ یہیں یہاں ایک شہر بسا دے۔ جنگل بڑا وحشت ناک ہے سامانہ کا شہر یہاں سے بہت دور ہے اور مالگذاری کا روپیہ وہاں داخل کرنے میں ہمیں دقت ہوتی ہے۔ شیخ موصوف نے ان کی استدعا قبول کر کے بادشاہ سے سفارش کی اور سلطان فیروز شاہ نے جو اس وقت ہندوستان کے فرمان روا تھے سفارش منظور کر کے یہاں قلعہ کی بنیاد ڈالی اور سرہند کا شہر تعمیر کرایا۔ شہر تعمیر ہونے پر بادشاہ نے شیخ مذکور سے التماس کی کہ وہ اسی جگہ سکونت اختیار فرمایئں اور وہاں کے محصولات کی جو کچھ آمدنی ہو وہ اپنی حسب مرضی فقرا اور درویشوں پر صرف کیا کریں۔ چنانچہ شیخ رفیع الدین نے وہاں مستقل سکونت اختیار کی اور ان کی نسل میں امام صاحب ایسے آفتاب طریقت پیدا ہوئے جس نے نہ صرف سرہند اور ہند کو بلکہ تمام دنیا کو منور فرمایا اور آج ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں عقیدت مند ان کے حلقہ بگوش ہیں اور ان سے منسوب ہونا اور اپنے تئیں مجددی کہلانا باعث فخر سمجھتے ہیں ۔

آپکے والد ماجد کا نام نامی شیخ عبد الاحد ہے۔ شروع جوانی میں علوم ظاہری کی تحصیل کر رہے تھے کہ یکایک راہ باطنی کا شوق دامن گیر ہوا۔ اپنے تئیں حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کی خدمت میں پہونچایا۔ بیعت سے مشرف ہو کر درویشوں کے ساتھ رہنے کی درخواست کی۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ پہلا فرض علوم دین کی تحصیل ہے بے علم درویش کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ اس لئے پہلے

علوم دینیہ کی تحصیل کرو۔ یہ سنا تو شیخ کی کبر سنی پر خیال کر کے عرض کی کہ مجھے خوف ہے کہ کہیں پھر اس صحبت گرامی کو نہ پاؤں اور اس نعمت عظمےٰ (سلوک راہ تصوف) سے محروم رہوں۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ اگر میرا انتقال ہو جائے تو میرے فرزند رکن الدین سے استفادہ کرو۔ حسب الحکم تحصیل علم کے لئے رخصت ہوئے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد واپس آئے تو حضرت شیخ کا انتقال ہو چکا تھا شیخ رکن الدین کی خدمت میں رہنا اختیار کیا اور ان کے فیض صحبت سے طریقۂ قادریہ اور چشتیہ کی خلافت حاصل کر کے طالبان راہ حق کی تلقین و تربیت میں مشغول ہوئے۔ علاوہ ازیں حضرت شیخ جلال تھانیسری کے فیض صحبت سے بھی بہرۂ کافی حاصل کیا اور ان کے توسط سے حضرت شاہ کمال کیتھلی سے بھی ملاقات ہوئی۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں (شیخ عبد الاحد والد مجدد صاحب اور شاہ کمال) کی الفت حد درجہ تک پہونچ گئی اور بسا اوقات حضرت شاہ کمال کی مصاحبت سے بھی آپکو بیش بہا فوائد اور فیوض حاصل ہوئے۔ ۱۰۰۷ھ ہجری میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپکے سات صاحبزادے تھے حضرت مجدد صاحب عمر کے لحاظ سے چوتھے مرتبہ میں واقع ہوئے ہیں۔

ولادت باسعادت حضرت مجدد کی ۹۷۱ھ ہجری شہر سرہند میں ہوئی۔ ایام طفولیت میں ایک فطرت شناس بزرگ جو آپ کو دیکھا بے ساختہ کہہ اوٹھا کہ یکاد زیتہا یضیئ ولو لم تمسسہ نار (اسکی فطرت کا چراغ خود بخود بھڑک اوٹھنے کیلئے آمادہ ہے) حضرت شاہ جب کبھی سرہند میں تشریف لاتے تو ان کے حالات پر نہایت ہی توجہ فرماتے۔

چار سال کی عمر میں آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا اور بہت جلد آپنے قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اسکے بعد اپنے والد کے ہاں تحصیل علوم میں مشغول ہوئے اور اکثر علوم انہیں سے حاصل کئے علم میں وہ ملکہ پیدا کیا کہ دقیق سے دقیق مسائل کو پانی کی طرح حل کر دیا کرتے۔

علاوہ ازیں اس زمانہ کے دوسرے علماء کبار سے بھی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ سیالکوٹ پہونچ کر مولانا محقق کمال کشمیری سے عضدی وغیرہ مشکل کتابیں پڑہیں۔ اور علم حدیث میں شیخ یعقوب کشمیری اور قاضی بہلول بدخشانی کو استاد بنایا۔ شیخ یعقوب وہ شخص ہیں جنہوں نے مدتوں حرمین شریفین میں رہکر وہاں کے بڑے بڑے محدثین سے کتب حدیث کی سند حاصل کی تھی۔ قاضی بہلول کے آبا و اجداد نے علم حدیث میں بڑا نام پایا تھا اور ان کا خاندان دوائر علمیہ میں بیت الحدیث کے لقب سے مشہور تھا۔

تحصیل علوم معقول و منقول اور استفادۂ فروع و اصول سے فارغ ہوکر مسند افادہ اور تدریس پر جلوہ آرا ہوئے اور ایک مدت تک علوم کے تشنہ لبوں کو اپنے رشحات فیض سے سیراب فرماتے رہے۔ اس زمانہ میں بعض عالمانہ رسائل بھی نہایت فصیح و بلیغ عربی اور فارسی زبان میں تالیف فرمائے۔

منجملہ ان کے رسالۂ تہلیلیہ ہے جو عقائد اہل تشیع کی تردید میں لکھا گیا ہے۔

ان دنوں میں آگرہ دار السلطنت تھا۔ اکبر بادشاہ کا زمانہ تھا اور وہاں علماء و فضلا کی کثرت رہتی تھی۔ آپ کو بھی وہاں جانیکا شوق دامنگیر ہوا اور جب وہ آگرہ میں تشریف لیگئے تو ان کے علم و فضل کا بڑا چرچا ہوا۔ فیضی اور ابو الفضل مشہور اہل کمال اور مقرب سلطانی تھے۔ انہوں نے چاہا کہ حضرت امام صاحب ان کے مکان پر تشریف لیجائیں۔ لیکن آپ نے اپنی خودداری (اعتزاز نفس) میں فرق نہیں آنے دیا۔ چونکہ وہ خود اہل علم اور علم کے قدرشناس تھے خود ان کے ملنے کے لئے آئے اور اپنے مکان پر لیجا کر تین دن تک مہمان رکھا۔ ربط ضبط بڑھ جانے پر جانبین سے ملاقات کا سلسلہ قائم ہوا۔ کبھی وہ آپ کے مکان پر آتے اور کبھی آپ ان کے مکان پر تشریف لے جاتے۔

ایکدن کا ذکر ہے کہ آپ فیضی کے مکان پر گئے۔ اسوقت میں وہ اپنی مشہور بے نقط تفسیر لکھ رہا تھا۔ آپ کو دیکھکر نہایت مسرت کا اظہار کیا اور کہنے لگا آپ خوب موقع پر تشریف لائے۔ میں اس وقت ایک بڑی دقت میں مبتلا تھا۔ فلاں آیت کی تفسیر کو بے نقطہ حروف میں تعبیر کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔ بڑی دیر سے دماغ سوزی کر رہا ہوں لیکن حسب دلخواہ عبارت نہیں بن آتی۔ حضرت کو باوجودیکہ اس قسم کی طبع آزمائی کرنیکا پہلے کبھی موقع نہیں ملا تھا مگر پھر بھی اس مقام کی تفسیر بے نقط حروف میں ایسی فصاحت و بلاغت سے تحریر فرمائی کہ فیضی دنگ رہ گیا۔

اظہار حق میں آپ مطلق خوف و لحاظ نہیں کرتے تھے اور جو حق بات ہوتی تھی بے دھڑک کہدیا کرتے تھے چنانچہ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ ماہ رمضان کی انتیس تاریخ پر عید الفطر کا چاند نظر نہ آیا۔ بادشاہ نے کہدیا کہ میں نے چاند دیکھا ہے اور سب لوگوں نے عید منالی۔ عالموں نے بھی بادشاہ کی خاطر فتوی دیدیا۔ اتفاق سے اس دن امام صاحب ابو الفضل کے مکان پر تشریف لے گئے۔ ابو الفضل نے کہا کہ مجھے آپکے چہرہ سے روزہ کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے اثبات میں جواب دیا۔ ابو الفضل نے کہا آخر سبب کیا ہے؟ فرمایا اس قدر کدورت آسمان پر نہیں تھی کہ بادشاہ کے سوا اور کسی کو چاند نظر نہ آسکا۔ جبتک ایک جم غفیر شہادت نہ دے عید الفطر کا حکم شرعاً نہیں دیا جاسکتا۔ ابو الفضل نے کہا یہ باتیں جانے دیجئے اور روزہ افطار کیجئے یہ کہکر پانی منگایا لیکن امام صاحب نے کٹورے کو ہاتھ سے ہٹا کر سب پانی گرا دیا۔

غرض آگرہ میں آپ کی طبیعت لگ گئی اور ایک مدت تک وہاں اقامت پذیر رہے۔ آپکے والد ماجد کو آپکے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا اور بذات خود آگرہ میں آکر امام صاحب کو اپنے ساتھ سرہند میں

لے گئے۔ اس کے بعد امام صاحب اپنے والد ماجد ہی کی خدمت میں رہے۔ اسی اثنا میں اپنے والد بزرگوار سے طریقۂ قادریہ کے اصول کے مطابق کسب طریقت کرتے رہے اور بہت سے فوائد باطنیہ حاصل کئے۔ طریقۂ چشتیہ کی "نسبت" بھی آپ کو یہاں سے حاصل ہوئی۔ لیکن کمال تقوے اور اتباع سنت مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے بمصداق "خذ ما صفا ودع ما کدر" (صاف بات لیلیا کرو اور کدورت آمیز باتوں کو جانے دو) سماع اور تواجد ورقص وغیرہ سے جو اس سلسلۂ عالیہ کی رسم ہے بہت احتراز فرماتے تھے۔

آپ کو حج خانہ کعبہ اور زیارت روضۂ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا سخت اشتیاق دامنگیر رہا کرتا تھا لیکن اپنے والد بزرگوار کی کبرسنی پر خیال کر کے اس ارادہ کو عمل میں نہیں لاسکتے تھے۔ جب قضائے الٰہی سے حضرت والد ماجد کا ۱۰۰۷ ہجری میں انتقال ہوگیا تو آپ نے ۱۰۰۸ ہجری میں سفر حرمین شریفین کے لئے تیاری کی۔ دہلی پہونچکر مولانا حسن کشمیری سے ملاقات ہوئی جو آپ کے آشنائے قدیم اور حضرت خواجہ باقی باللہ رح کے بھی مخلصان صمیم میں سے تھے۔ انہوں نے آپ سے حضرت خواجہ کا ذکر کیا اور کہا کہ آج سلسلہ علیہ نقشبندیہ میں ان کی نظیر چار دانگ عالم میں نہیں پائی جاتی طالبان راہ حق کو ان کی ایک ہی صحبت بابرکت میں وہ فیوض اور فوائد باطنی حاصل ہوتے ہیں جو دوسروں کو سالہا سال کی ریاضات شاقہ اور برسوں کے چلوں سے بھی میسر نہیں ہوتے۔ چنانچہ آپ خواجہ صاحب کی خدمت میں زیارت کیلئے حاضر ہوئے۔ حضرت خواجہ نے ارادہ دریافت فرمایا آپ نے عرض کیا زیارت کعبہ کا شوق دامنگیر ہے۔ حضرت خواجہ نے فراست ایمانی کے نور سے آپ کی فطری استعداد کو معلوم کر کے فرمایا مبارک ارادہ ہے لیکن اگر چند دن فقراء کی صحبت میں رہو تو کچھ حرج نہیں۔ آپ نے ایک ہفتہ کیلئے قیام کا عزم مصمم کرلیا۔ ان دنوں میں آپ پر خودبخود کسب طریقت اور تکمیل راہ تصوف کا اشتیاق غالب ہوا۔ حضرت خواجہ ایسے قابل جوہر کی تربیت کے لئے پہلے ہی سے آمادہ تھے۔ دو تین مہینہ تک حضرت خواجہ کی صحبت میں رہنے سے آپ نے وہ فیوض و برکات حاصل کئے اور ان مدارج عالیہ تک ترقی ہوئی جس کی ادنےٰ ترین کیفیت کا اظہار کرنے سے بھی قلم زبان اور زبان قلم قاصر ہے۔

الغرض خداوند پاک جل وعلا کے فضل اور حضرت خواجہ کے حسن تربیت سے آپ اس درجہ تک پہونچے کہ دوسروں کی تکمیل وارشاد کا جلیل القدر منصب ان کے تفویض ہوا چنانچہ حضرت خواجہ نے ان کو اپنی خلافت سے مشرف کر کے طالبان راہ حق کی تربیت کی اجازت کاملہ عطا

فرمائی اور سرہند کو جو آپ کا وطن مالوف تھا واپس فرمایا۔ حضرت خواجہ نے رخصت فرماتے وقت ایک جماعت طالبان صادق کی بھی آپ کے ہمراہ کر دی +

کچھ مدت کے بعد پھر آپ کو حضرت شیخ قدس سرہ العزیز کا شوق ملازمت دامنگیر ہوا اور فوراً سرہند سے دہلی چلے گئے۔ مدت مدید تک پیر بزرگوار کی خدمت بابرکت میں رہے اور عظیم الشان معنوی فتوحات حاصل کیں۔ اس اثنا میں حضرت خواجہ نے اُن طالبان حق کی تربیت وارشاد کا کام بھی آپ کے حوالہ فرمایا جو خود حضرت شیخ کی صحبت میں جویان فیض تھے اور آپنے زمانۂ دراز تک حضرت خواجہ کے سامنے تکمیل طلاب میں مشغول رہکر بالآخر اپنے وطن مالوف کو مراجعت فرمائی +

ابھی بہت عرصہ نہیں گذرنے پایا تھا کہ آپ پھر حضرت خواجہ کی زیارت کیلئے دہلی تشریف لے آئے۔ حضرت خواجہ اس وقت سخت بیمار تھے اور زندگی کی امید بہت کم تھی۔ انہوں نے اپنے فرزند ارجمند خواجہ عبید اللہ اور خواجہ محمد عبید اللہ کو جو اس وقت شیر خوار تھے بلا کر آپ سے فرمایا کہ ان کے حق میں اہل تصوف کے اصول کے مطابق باقاعدہ "توجہ" کریں۔ آپنے حضرت خواجہ کے ارشاد کے بموجب پیرزادوں کے حق میں توجہات عالیہ فرمائیں چنانچہ ان کا اثر دونوں صاحبزادوں میں بیّن طور پر ظاہر ہوا۔ آپ وہاں چند دن قیام کر کے واپس سرہند تشریف لائے اور پھر آپکو حضرت خواجہ کی ملاقات میسر نہ ہو سکی +

تھوڑی دیر تک آپ وطن میں رہے اسکے بعد آپ حضرت خواجہ کے ایما سے لاہور تشریف لیگئے۔ وہاں کے سب چھوٹے بڑوں نے آپ کی نہایت تعظیم کی۔ بے شمار لوگ آپ کے سلسلۂ بیعت میں داخل ہوئے اور ہزاروں خلق اللہ نے آپ کے فیوض باطنی سے استفادہ کیا امام صاحب لاہور ہی میں تھے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے انتقال کی خبر آپ کو پہونچی۔ آپ یہ خبر سنتے ہی لاہور سے دہلی میں آئے۔ حضرت خواجہ کی وفات سے ایک اضطراب پھیلا ہوا تھا آپ کے تشریف لانے سے سب کو تسکین ہو گئی اور تشنہ لبان معارف نے تربیت اور صحبت کیلئے التماس کیا آپنے قبول کیا اور ایک مدت تک وہاں قیام فرما کر ارشاد و تکمیل طالبان صادق کی کرتے رہے۔ ارادتمندان طریقت کو ویسے ہی فیوض و برکات حاصل ہونے لگے جو حضرت خواجہ کی حیات میں ان کو میسر ہوتے تھے۔ بعض حاسدوں نے فتنہ پردازی کر کے حضرت خواجہ کے مخلصوں میں ناچاقی پیدا کر دی اور طرح طرح کے شبہات ان کے دلوں میں ڈالدیئے۔ امام صاحب نے ہر چند سمجھایا اور اخلاص و اتحاد کی تاکید فرمائی لیکن ان پر کچھ مفید اثر نہ ہوا اسلئے آپنے

وہاں رہنا مناسب نہ سمجھا اور سرہند کو تشریف لے آئے۔ اسکے بعد امام صاحب کا یہ معمول رہا کہ ہر سال عرس کی تقریب سے دہلی میں تشریف لیجاتے اور پھر جلد تر اپنے وطن مالوف کو معاودت فرماتے۔

ہر ایک زمانہ میں ظاہر پرست اہل جمود کا ایک گروہ ایسا بھی رہا ہے جو اولیا اور اہل اللہ کے منکر ہوتے ہیں۔ ان کو بغض اور عداوت کی نظروں سے دیکھتے اور ان کی تکلیف و ایذا میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے ہیں۔ امام صاحب کا عہد بھی اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں تھا آپکے مقابلہ میں بھی ایک ایسی جماعت موجود تھی جو ان کی مخالفت پر کمربستہ اور ان کے عروج اور روز افزوں ترقی و کامیابی کو کبھی دل شاد ہو کر ٹھنڈی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتی تھی ؎

ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیبے ست ✦ گل ست سعدی و در چشم دشمناں خارست

ان لوگوں کا امام صاحب پر کسی طرح بس نہیں چل سکتا تھا اسلئے وہ دل ہی دل میں جلا کرتے اور موقع کے منتظر رہتے۔ ایک دفعہ امام صاحب نے حضرت خواجہ کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا جس میں انہوں نے اپنے متعلق عروج مقامات وغیرہ کی کیفیت بطور عرض حال لکھی تھی۔ اسمیں یہ فقرہ بھی لکھا تھا کہ:"فوق آں مقام مقام صدیق اکبر ظاہر شد ...... پس بآں مقام رسیدہ شد الخ" مخالفین حساد نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھکر اس عریضہ کی ایک نقل نورالدین جہانگیر بادشاہ کے دربار میں پیش کی اور کہا کہ یہ شخص اپنے آپکو حضرت صدیق اکبرؓ سے بھی افضل جانتا ہے۔ بادشاہ ان کلمات کو سنکر برافروختہ ہو گیا اور امام صاحب کی طلبی کا حکم صادر کیا جب آپ تشریف لائے تو پہلا سوال بادشاہ نے یہ کیا کہ تم اپنے آپکو حضرت صدیق اکبر سے افضل جانتے ہو؟ آپنے نفی میں جواب دیا۔ عریضہ کی عبارت کے متعلق فرمایا کہ اسمیں سیر و سلوک اور باطنی عروج مقامات کا ذکر ہے جو صوفیہ کو پیر کامل کی توجہ سے میسر ہوتا ہے۔ اس سے افضلیت کا کچھ بھی توہم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی توضیح ایک مثال سے ہو سکتی ہے۔ مثلاً شاہی دربار میں امرائے نامدار اور مقربان ذی اقتدار شب و روز حاضر رہتے ہیں لیکن اگر بادشاہ کسی ادنےٰ سپاہی یا چپڑاسی کو ایک لحظہ بھر کیلئے اپنے پاس بُلالے ذرہ سی دیر کیلئے اس کو بساط قرب پر کھڑا رہنے دے اور پھر اپنی جگہ پر بھیجدے تو یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سپاہی یا چپڑاسی ان امراء و وزراء کے برابر یا اون سے افضل ہے جو حقیقی طور پر مقربان بارگاہ ہیں۔ گو ایک لمحہ کیلئے وہ ان مقرب اُمراء و وزراء کی کرسیوں سے آگے گذر کر بادشاہ کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہو گیا۔ ہمارے عروج کی بھی بعینہٖ یہی مثال ہے علاوہ ازیں مَیں نے اپنے عریضہ میں تصریح کر دی ہے کہ "بعکس آں مقام خود را نگین یافت" ایک صاف بات ہے کہ اگر کوئی شخص یا کوئی چیز آفتاب کے عکس سے روشن ہو تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ شخص یا وہ چیز

آفتاب کے مقام پر پہونچ گئی زمین ہر روز آفتاب کے عکس سے رنگین ہوتی ہے لیکن زمین اور آفتاب کے مقام میں جو فرق ہے وہ ہر ایک شخص کو معلوم ہے حضرت مجددؒ کے مدلل اور معقول کلام کو سنکر بادشاہ کا شک رفع ہو گیا اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ آپ کو رخصت کیا ۔

مخالفوں کو جب اس تدبیر نامحمود میں کامیابی نہوئی تو وہ ایک اور چال چلے اور بادشاہ کو دوسرے پیرایہ میں برافروختہ کیا۔ انہوں نے ایک مناسب وقت میں بادشاہ کو اس طرف توجہ دلائی کہ شیخ احمد (امام صاحب) کے ہزاروں بلکہ لاکھوں مرید ہیں اور توران وماوراء النہر کے سلاطین اور حکمران انکے حلقہ بگوش عقیدتمند ہیں سینکڑوں خلیفے اس کے جابجا قیام رکھتے ہیں جنہوں نے شاہی سپاہ اور اکثر ارکان سلطنت کو بھی مسخر بنا رکھا ہے انکا وجود سلطنت کیلئے سخت خطرناک ہے۔ ابھی سے اسکا انسداد کرنا چاہیئے ورنہ ؎ کار چو از دست رفت سیخ وندامت چہ سود۔ حضور اس کو اپنی مجلس سلطانی میں بلائیں اور سجدۂ تحیہ (تعظیمی سجدہ) کرنے کا حکم دیں اگر وہ سجدۂ تحیہ بجالایا تو بہتر نہیں تو صاف ظاہر ہوگا کہ وہ حضور والا کا مخالف ہے۔ امام صاحب بلائے گئے لیکن اونہوں نے غیر خدا کیلئے سجدہ کرنے کو شرک بتاکر سجدہ کرنے سے قطعی انکار کیا۔ اب تو حاسدوں کی بن آئی اور انہوں نے ایک شور برپا کر دیا۔ خوشامد پسند علماء نے شیخ کو بادشاہ کا نافرمان قرار دیکر اسکے قتل کا فتوے لکھدیا۔ الغرض بادشاہ کے حکم سے امام صاحب گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیئے گئے اور پورے دو برس محبوس رہے قیدیوں کیلئے آپکا وجود مسعود برکت کبرے ثابت ہوا۔ ایک کثیر تعداد کافر قیدیوں کی مشرف باسلام ہوئی اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں مسلمانوں کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب فرمایا۔ گمراہ راہ راست پر آئے اور منتہین مدارج عالیہ پر فائز اور سرافراز ہوئے۔ امام صاحب نے بادشاہ کے حق میں کبھی بددعا نہیں کی بلکہ یہی فرماتے کہ میرا یہاں قید ہونا ایک امر مقدر تھا۔ خدا کے کاموں میں بڑی بڑی غامض حکمتیں ہوتی ہیں۔ بعض مقامات عالیہ تک عروج حاصل کرنا اس نزول بلا پر منحصر تھا علاوہ ازیں اگر جہانگیر مجھے یہاں نہ بھیجتا تو اتنے لوگ فوائد ظاہر اور باطن سے کیونکر مستفید ہوتے۔ دو سال کے بعد بادشاہ خود اپنی اس حرکت بے جا پر نادم ہوا حضرت شیخ کو اپنے پاس بلاکر بڑے اعزاز و اکرام سے پیش آیا۔ بیش از بیش معذرت کر کے ارادتمندوں کے حلقہ میں داخل ہوا اور آپسے اسقدر اتحاد بڑھا کہ اپنے پاس سے جدا تک نہیں کرتا تھا چنانچہ امام صاحب آٹھ سال تک برابر عسکر سلطانی کے ساتھ ساتھ رہ گئے۔ صاحب برکات احمدیہ لکھتے ہیں کہ حضرت کے اس طرح عسکر سلطانی کے ہمراہ رہنے میں بھی بڑی حکمت تھی۔ بہت سے آدمی جو کسی وجہ سے آپ کی خدمت تک نہیں پہونچ سکتے تھے اس ذریعہ سے سعادت اندوز ہوئے۔ اسی اثناء میں شاہزادہ خورم (جو پیچھے شاہجہاں کے نام سے حکمران ہوا) نے بھی آپکے ہاتھ پر بیعت کی متعدد امراء اور وزراء آپسے فیضیاب ہوئے۔ اور امام صاحب کی

کوشش سے شریعت مقدسہ کے کئی مردہ احکام از سر نو زندہ ہو کر جاری ہوئے +

۱۰۳۴ھ ہجری میں آپ اجمیر شریف میں تھے کہ آپ نے فرمایا آثار رحلت کے آثار قریب معلوم ہوتے ہیں اور یہ عبارت سرہند میں صاحبزادوں کو لکھکر بھیجی "ایام انقراض عمر نزدیک و فرزنداں دور" اس اثنا میں ایک سال اور گذر گیا اور آپ ایک مرتبہ پھر حضرت خواجہ معین الدین کی زیارت پُر بشارت کیلئے اجمیر چلے گئے۔ جب واپس سرہند تشریف لائے تو آپ نے عزلت اختیار کی۔ جمعہ کی نماز کے سوا کبھی باہر نہ آتے اور پانچوں وقت کی نماز باجماعت خلوت ہی میں ادا فرماتے۔ صاحبزادوں اور معدودے چند مخلص احباب کے سوا اور کوئی شخص اندر نہیں جانے پاتا تھا۔ اسی طرح زمانہ تنہائی کو چھ سات مہینہ گذر گئے تو آپ کو حسب معمول ضیق النفس کا دورہ عارض ہوا جو ہر سال ہوا کرتا تھا۔ مولانا بدرالدین سرہندی فرماتے ہیں کہ یہ سترہویں ذی الحجہ کا دن تھا۔ ساتھ ہی بخار کی شکایت ہو گئی اور گذشتہ سالوں کی نسبت زیادہ تکلیف محسوس ہونے لگی۔ درمیان میں کچھ افاقہ ہو گیا لیکن ۱۲ صفر کو ایک اتفاق پیش آیا۔ عصر کا وقت تھا کہ آپ نے صوفیوں کو قبائیں بانٹنا شروع کیں۔ اوس وقت آپ فقط فرجی پہنے ہوئے تھے۔ سردی کی وجہ سے بخار ہوا اور آپ صاحب فراش ہو گئے۔ اس ضعف کی حالت میں بھی آپنے کوئی نماز بے جماعت نہیں پڑھی۔ قومہ و جلسہ اور دیگر آداب نماز اچھی طرح ادا فرماتے۔ مسنون اور مستحب دعاؤں تک کو ترک کرنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس مرض میں آپ اکثر اوقات حاضرین کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عمل پیرا رہنے اور شریعت مقدسہ کے تمام تر احکام و آداب کی نہایت احتیاط کے ساتھ مراعات کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ یہ بھی فرماتے کہ میری تجہیز و تکفین میں حدود شرعیہ کا پورا پورا خیال رکھنا۔ یہ بھی وصیت فرمائی کہ میری قبر گمنام جگہ میں ہو۔ قبر کچی بنائی جائے اور پختہ بنانے سے احتراز کیا جائے۔ الغرض سہ شنبہ کے دن ۲۹ تاریخ صفر ۱۰۳۴ھ ہجری کو جبکہ آپکی عمر شریف ۶۳ سال کی تھی وہ آفتاب حقیقت جس نے اپنے فیضان کے شعاعوں سے ایک عالم کو منور کر رکھا تھا غروب ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ +

آپنے متعدد تصنیفیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے بعض مشہور کتب و رسائل کے نام یہ ہیں:
رسالہ تہلیلیہ۔ (رد روافض میں) رسالہ اثبات النبوۃ۔ رسالہ مبدء و معاد۔ رسالہ مکاشفات غیبیہ رسالہ آداب المریدین۔ رسالہ معارف لدنیہ (اسمیں آپنے اپنے مخصوص احوال و مقامات کا شرح و بسط سے ذکر فرمایا ہے) رسالہ ردشیعہ۔ تعلیقات عوارف (امام الطریقت شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور و معروف مقبول عالم کتاب عوارف العارف کے غوامض کی تشریح کی ہے) شرح

رباعیات خواجہ عبدالباقی رحہ

امام صاحب کی سب سے مشہور اور ممتاز تصنیف آپ کے مکتوبات ہیں جو تین ضخیم جلدوں میں ختم ہوئے ہیں جن کا ہر ایک مکتوب بجائے خود ایک مستقل رسالہ تصور کئے جانے کے قابل ہے۔ آپ کی تمام تصانیف اور خصوصاً مکتوبات شریفہ تصوف اور علم حقیقت کے اسرار و معارف سے لبریز ہیں۔ تصوف اور معرفت کے بڑے بڑے عظیم الشان اور معرکۃ الآرا مسائل کو نہایت خوبی کے ساتھ حل کیا گیا ہے۔ کئی ایک اہم غلطیاں جو زمرۂ اہل تصوف میں مدتہائے دراز سے چلی آتی تھیں اپنی تصنیفات میں جابجا ان کو رفع کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ آپکا طرز تحریر ہمیشہ مجتہدانہ ہوتا ہے اور اہم مسائل میں نہایت تحقیق و تدقیق سے کام لیتے ہیں۔ چونکہ آپ کی سوانحعمری کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھنے کا التزام کیا گیا ہے اس لئے آپ کی مصنفات پر تفصیلی نظر نہیں کی جاسکتی۔ ناظرین سے التماس ہے کہ اسیقدر اجمالی تذکرہ پر اکتفا فرمائیں +

کسی خدارسیدہ بزرگ اور ولی اللہ کی سوانح عمری کو عام طور پر مکمل نہیں سمجھا جاتا جبتک اس مرد خدا کی کرامتوں کا بھی مفصل ذکر نکیا جائے جس کی وجہ بالکل واضح اور صاف ہے۔ خرق عادات کے ذکر کرنے سے عموماً تذکرہ نویس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جس شخص کا تذکرہ (سوانحعمری) لکھنے کیلئے میں نے قلم اوٹھایا ہے وہ درحقیقت صاحب ولایت ہے ورنہ تذکرہ نویس کے اصل مدعا کو مدنظر رکھکر انکا بیان کرنا چنداں ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ بفحوائے آیت کریمہ لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (سورہ یوسف رکوع ۱۲) (ضرور انبیاء کے حالات بیان کرنے سے ذی عقل اور صاحب بصیرت مومنوں کو کسی نہ کسی طرح عبرت حاصل ہوتی ہے) کسی بڑے شخص کے حالات زندگی پڑھنے سے اپنے ہی لئے مختلف طریق پر عبرت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن مذکورہ بالا نقطۂ خیال سے (اثبات ولایت کے لحاظ سے) بھی میں خارق عادات کا ذکر کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ بہ وجوہ مفصلہ ذیل (۱) خارق عادت کی بحث اس قدر دقیق غامض اور پیچیدہ ہے کہ کسی شخص سے بظاہر خارق عادت کا سرزد ہونا ہرگز اس کی کرامت یا ولایت پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ دقت بحث اور غموض حقیقت کی وجہ سے یہ مسئلہ ہمیشہ چوٹی کا معرکۃ الآرا مسئلہ رہا ہے جسکا نتیجہ بڑے بڑے عقلمندوں کے منکر خوارق یا منکر کرامت ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ اور اسلئے کسی شخص کی ولایت ثابت کرنے کے لئے خارق عادت کے ظہور سے استدلال کرنا فضول ہے (۲) بڑے بڑے ارباب طریقت اور خود امام صاحب نے اپنے مکتوبات میں تصریح فرمائی ہے کہ خارق عادت کا معرض ظہور میں آنا کرامت اور ولایت کی دلیل نہیں۔ خواجہ عبداللہ انصاری جو بہت بڑے بزرگ صوفی اور مین لاکھ

حدیث کے حافظ تھے فرماتے ہیں "اگر بروئے دریا روی خسے باشی۔ واگر برہوا پری مگسے باشی۔ دل بدست آرتا کسے باشی" اگر تو دریا پر بغیر کشتی کے چل سکتا ہے تو تیری وقعت ایک خس سے بڑھکر نہیں۔ اگر تو ہوا میں بھی پرواز کر سکتا ہے تو ایک مکھی سے زیادہ عظمت تو نہیں حاصل کر سکا۔ دل کو قابو میں لا کہ تو آدمی بنجائے" "دل کو قابو میں لانا" یہ ایک پر معنے حقیقت ہے جس کی کسیقدر تفصیل احیار علوم کے کتاب القلب کے مضامین دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ سعدی علیہ الرحمۃ اپنی تصانیف میں عارفانِ طریقت کو صاحب دل کے لفظ سے تعبیر فرماتے ہیں۔ فافہم) امام صاحب نے مکتوبات شریفہ میں کئی موقعوں پر نہایت زور کے ساتھ اس مضمون کو بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک موقعہ پر لکھتے ہیں "حضرت صدیق اکبرؓ جو بالاجماع انبیاء کے بعد سب لوگوں سے افضل ہیں اور اولیائے امت سے کہیں بڑھ کر مرتبہ رکھتے ہیں ان سے بہت کم خارق عادت منقول ہیں تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جن اولیاء سے بکثرت خارق عادات کا سرزد ہونا منقول ہے وہ صدیق اکبر سے افضل ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خارق عادات کا ظہور ثبوت ولایت یا افضلیت کا معیار نہیں۔ (۳) حجۃ الاسلام امام محمد غزالی صاحب اپنی ایک مشہور محققانہ رسالہ القسطاس المستقیم میں ایک نہایت واضح مثال بیان کر کے اس دقیق مسئلہ کو اس طرح حل فرماتے ہیں "ایک شخص دعوے کرتا ہے کہ میں حافظ قرآن ہوں۔ اس کے ثبوت میں وہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ میں لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں چنانچہ وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ عجیب وغریب فعل دکھا دیتا ہے۔ لیکن دوسرا ایک شخص ہے جو اس قسم کا کوئی کرشمہ نہیں دکھا سکتا اور نہ ایسے کرشموں کے دکھانے کا مدعی ہے وہ اپنے حافظ قرآن ہونے کا اس طرح ثبوت دیتا ہے کہ قرآن کو اول سے آخر تک نوک زبان سنا دیتا ہے۔ بھلا بتائیے تو کہ تم کو کس شخص کے حافظ قرآن ہونے پر زیادہ اعتبار ہوگا اور کس شخص کو تم سچے دل سے حافظ کہوگے۔ اسی طرح طبیب ہونیکا سب سے زبردست ثبوت یہی ہے کہ اسکے علاج سے مریضوں کو شفا حاصل ہو اور تشخیص امراض کا طریقہ طبی اصول کے مطابق بیان کر سکے۔ پھر آگے چلکر امام صاحب (غزالی رح) اس بحث کی تکمیل اس طرح فرماتے ہیں "جس طرح حافظ قرآن ہونے اور لاٹھی کو سانپ بنانے میں کچھ بھی مناسبت نہیں اسیطرح نبوت یا ولایت اور خارق عادت میں بھی لازم وملزوم ہونے کا کوئی علاقہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جس وصف کا اثبات کسی شخص میں مطلوب ہو پہلے اس وصف کی حقیقت اور مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے اور جب وہ مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے اس وقت یہ معلوم کرنا دشوار نہیں کہ کون اس وصف سے بہرہ ور ہے اور کس میں یہ وصف نہیں پایا جاتا۔ پہلے طب کا مفہوم یاد کر لو اور پھر تمہیں خود بخود معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں شخص طبیب ہے، یا نہیں۔ یہ کچھ ضرور نہیں کہ جو شخص

لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہے وہ حافظ قرآن یا طبیب بھی ہو (مسمرزم کے حیرت انگیز کرشموں نے آجکل اور بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈال دی ہے) اسی طرح نبوت اور ولایت کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کرو اور تمہیں فوراً معلوم ہو جائیگا کہ کون نبی یا ولی صادق ہے اور کون مدعی کاذب ہے" قرآن کریم میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو اسی اصول کے مطابق ثابت کیا گیا ہے۔ یہ ایک طویل الذیل مضمون ہے جس پر مفصل بحث کرنے کی اس مختصر رسالہ میں کسی طرح گنجائش نہیں۔ ایک ہی آیت لکھکر ختم کرتا ہوں وَقَالُوا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَاتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيَاتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ (مخالف لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ خارق عادات کا اظہار کیوں نہیں کرتا (لفظی معنے۔ اسپر خدا کی نشانیاں کیوں نہیں نازل ہوتیں) تو کہدے کہ خارق عادت کا ظہور خدا کے اختیار میں ہے اور مَیں تو صرف کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں۔ کیا وہ کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے ان کیلئے تمہاری نبوت کا زبردست ثبوت نہیں؟" نبوت کے مفہوم پر غور کریں اور انبیاء کے طرز تعلیم کو پیش نظر رکھکر خود فیصلہ کریں کہ قرآن کی معنی خیز اور مؤثر تعلیم ایک کذاب مفتری کے مونہہ سے صادر ہونا ممکن ہے؟) الغرض ان وجوہ کی بنا پر امام صاحب کی سوانحعمری میں خارق عادت کا ذکر عمداً ترک کر دیا گیا ہے۔ آپکی تصنیفات اور آپ کی تعلیمات کو اگر غور و امعان سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ایک بصر کی نقاد نظروں میں آپکی ولایت اور ہادی طریقت ہونیکا سب سے زیادہ زبردست ثبوت ہے ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب + گر دلیلے بایداز وے رو متاب

علاوہ ازیں امام صاحب ایک مسلم الولایت شیخ طریقت ہیں جن کے سینکڑوں خلفا آج بھی مسند ارشاد و تکمیل پر جلوہ آرا ہو کر طالبان صادق کی روحانی تربیت میں مشغول ہیں اور ایک عالم کو اپنے فیض باطن سے مستفید کر رہے ہیں طریقہ علیہ نقشبندیہ میں شاخ مجددیہ کی بنا انہوں نے ڈالی ہے۔ اور اب تمام مشائخ نقشبندیہ مجددی کہلانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ ایسے بزرگ کی ولایت کو خارق عادت کی طویل الذیل و کثیر الفروع داستان چھیڑ کر ثابت کرنا میری ناقص رائے میں یا وہ گوئی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ؎ وَلِلنَّاسِ فِيْمَا يَعْشِقُوْنَ مَذَاهِبُ (ہر ایک شخص کا مذہب عشق جداگانہ ہے) والسلام خیر ختام +

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا مکتوب (۲۹)

(شیخ محمد مکی فرزند حاجی تاری موسیٰ لاہوری کے نام لکھا گیا)

{ولایت کے درجات۔ ولایت محمدی کا بیان۔ طریقۂ عالیہ نقشبندیہ کی راہ۔ اس طریقہ کے علو نسبت کا بیان۔ تمام طریقوں کی نسبت سے یہ نسبت اعلیٰ و افضل ہے۔ اس نسبت میں حضور دائمی حاصل ہوتا ہے۔}

آپ کا نامۂ گرامی نیاز مند کو ملا۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ لاکر بارگاہ الٰہی جل شانہ سے التماس ہے کہ خداوند کریم آپ کو اجر عظیم عنایت کرے مشکلیں آسان کردے۔ اور وسعت صدر نصیب کرکے اپنے جناب والا میں آپ کی معذرت اور توبہ قبول فرمائے۔

بھائیو! یہ جان لو کہ موت حقیقی کے ظہور میں آنے سے پہلے جب تک موت مجازی حاصل نہ ہو جس کو حضرات صوفیہ کی اصطلاح میں فنا کہتے ہیں تب تک خدائے پاک کے جناب قدس میں واصل اور باریاب ہونا ہرگز ممکن نہیں۔ بلکہ اس مرتبۂ عالیہ کے حصول سے پہلے ہی محال ہے کہ

معبوداتِ[1] باطلہ آفاقیہ و انفسیہ کی پرستش سے رستگاری میسر ہو۔ بندگانِ خاص کے
مقدس گروہ میں داخل ہونا اور اوتاد[2] و ولایت کے رتبۂ جلیلہ سے فائز ہونا تو درکنار مرحلۂ
فنا کو طے کرنے سے پیشتر حقیقی اسلام اور کامل ایمان بھی تو نہیں حاصل ہوتا لیکن
یہ بھی یاد رکھیں کہ مراتبِ ولایت کا یہ پہلا درجہ ہے اور تصوف و عرفان کی دشوار
گذار وادی میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے یہی کمال حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس سے
آپ قیاس کرسکتے ہیں کہ جس شے کی ابتدائی منزل اتنی اہمیت رکھتی ہے اُس کا نقطۂ
عروج اور منتہائے کمال کتنا وسیع ہوگا۔ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔

ولایت کے مختلف درجے ہیں اور اُن میں فاضل اور مفضول کے لحاظ سے برابر
فرق پایا جاتا ہے۔ جتنے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام گذرے ہیں ہر ایک کے اصول
ولایت اور طریقۂ وصول الی اللہ جداگانہ ہے۔ اُمتِ محمدیہ کے اولیاء اللہ میں وہ
تمام اصول اور طریقے پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک نبی کے نقشِ قدم پر چلنے سے ایک
ولایتِ مخصوصہ معرضِ ظہور میں آئی ہے جو اُسی خاص نبی کی طرف منسوب
کی جاتی ہے (مثلاً ولایتِ موسوی۔ ولایتِ عیسوی۔ ولایتِ ابراہیمی وغیرہ) ان

---

[1] جو اشیا نفسِ انسان سے باہر عالم میں موجود ہیں اُن کو آفاق کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے حضرت
امام صاحب نے معبوداتِ باطلہ کی دو قسمیں قرار دی ہیں (١) آفاقیہ (٢) انفسیہ۔ جن چیزوں کی خارج میں پرستش
کیجاتی ہے اور جو عام مشرکوں کا معبود واقع ہوئی ہیں۔ مثلاً آفتاب۔ عناصر۔ دیوتا وغیرہ ان سب کو معبوداتِ آفاقیہ
یا آلہۂ آفاقیہ کہینگے۔ بعض اوصاف جو باطنِ انسان میں موجود ہیں جنکی وہ پرستش کرتا ہے مثلاً حرص، ہوا و ہوس،
تکبر وغیرہ عاداتِ رذیلہ۔ جو شخص ان اوصاف کا اتنا منہمک ہے کہ ان اوصاف کے مقتضیات کے خلاف ہرگز نہیں کرتا یہی ان
اوصافِ رذیلہ کی پرستش ہے اور یہ اُس کے معبوداتِ انفسیہ یا آلہۂ انفسیہ کہلائینگے۔

[2] حضرت صوفیہ نے اولیاء اللہ کے مختلف اقسام کے لیے اپنی اصطلاح میں مختلف نام مقرر کیے ہیں
کسی کو غوث کسی کو قطب اور کسی کو ابدال کہتے ہیں اور ایک صنف کا نام اوتاد ہے۔

سب میں اعلیٰ درجہ کی ولایت وہی ہے جو حضرت خاتم النبیین محمد مصطفٰے احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم کے مطابق ہو کیونکہ وہ تجلی ذاتی[1] جس میں اسماء و صفات اور شیون و اعتبارات کا کیا بلحاظ ایجاب کے اور کیا بلحاظ سلب کے کچھ بھی اعتبار ملحوظ نہ ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ولایت مخصوصہ کی خصوصیت ہے۔ تمام وجوبی اور اعتباری حجابوں کا ذہنی اور خارجی دونوں حیثیتوں سے دور ہو جانا اسی ولایت کے طفیل میسر ہوتا ہے جس کو عارفانِ خدا شناس کے لفظوں میں وصلِ عریان کہتے ہیں اور اسی مقام پر وہم اور تخیل کے ظلمانی پردے حقیقتِ معرفت کے نورانی چہرہ سے اٹھ کر وجد حقیقی کا آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ ولایت اور یہ مقام فخر انبیا حضرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے مخصوص ہے۔ لیکن کاملانِ امت محمدیہ صلعم بھی اس عزیز الوجود مقام سے بے بہرہ و محروم نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے سے ان کو بھی اپنے پیمانہ

---

[1] یہ ایک نہایت دقیق بحث ہے جس کی تشریح لفظوں میں کما حقہ نہیں کی جا سکتی۔ شیون اور اعتبار کے مفہوم میں ایک نازک فرق ہے جس کی تفصیل کر دینا یہ موقعہ نہیں۔ خود حضرت امام صاحبؒ نے ایک مکتوب میں اس کی ممکن توضیح فرمادی ہے۔ البتہ اس قدر یاد رکھنا ضروری ہے کہ تجلی سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ خداوند پاک جل و علا کی ذات کا مشاہدہ بچشم سر حاصل ہوتا ہے۔ ان معنوں میں تو حضرات انبیا کو بھی کبھی تجلی حاصل نہیں ہوئی۔ خود حضرت امام صاحبؒ نے متعدد مکاتیب میں صوفیہ نامحدود کے اس خیال کا نہایت زور سے ابطال فرمایا ہے۔ محققین صوفیہ کے نزدیک تجلی سے مراد ایک انکشاف تام کی حالت ہے۔ نور وغیرہ الفاظ تنگیٔ میدان عبارت کی وجہ سے استعمال کئے جاتے ہیں اگر زیادہ تشریح مطلوب ہو اور اس مسئلہ کو حقیقی روشنی میں دیکھنا چاہیں تو حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب مشکوٰۃ الانوار یا اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ کریں۔ جس سے تجلی، نور، حجاب وغیرہ سب الفاظ متعلقہ کی حقیقت جہاں تک علم و قال کو تعلق ہے سمجھ میں آسکتی ہے۔

استعداد کے موافق ہوتا ہوا ظاہر ہوتا ہے۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ دولت عظمیٰ
آپ کو میسر ہو۔ اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ اس درجۂ عالیہ تک آپ رسائی حاصل
کریں تو سب سے مقدم بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں
ہمہ تن مشغول ہوں۔

تجلی ذاتی جس کا حصول ولایت محمدیہ سے مخصوص ہے اکثر مشائخ صوفیہ کے
نزدیک برقی کے نام سے موسوم ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایسی تجلی جس سے
اہل حقیقت کے قلوب میں وصل عریاں کی کیفیت نمودار ہوتی ہے۔ اور جس
میں اسماء و صفات حاجب و روپوش ذات کبریائی جل و علا نہیں ہوتے زیادہ دیر
تک قائم نہیں رہ سکتی۔ نہایت قلیل عرصہ کے لیے یہ حالت کسی سعادت مند کو
نصیب ہو تو ہو لیکن بہت جلد اسماء اور صفات کے حجاب ساتر ذات ہو کر اس
نور محض کو محجوب کر دیتے ہیں جس طرح بجلی کوند کر پھر ظلمت کے پردہ میں نہاں
ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تجلی ذاتی بھی ایک لمحہ بھر کے لیے رونما ہو کر پھر نقاب اسماء
و صفات کے پردہ میں مستور ہو جاتی ہے اور عارف باللہ کے اکثر اوقات غیبت
ذات (یعنی عدم حصول تجلے) کی حالت میں بسر ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ مشرب
نقشبندیہ کے اکابر طریقت نے تصریح فرمائی ہے کہ مراتب عرفان کا منتہائے
کمال یہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے حضور ذاتی حاصل ہو جس کا دوسرا نام تجلی ذاتی ہے۔
جو حضور اور تجلی زائل ہو کر غیبت کے حال سے بدل جائے وہ درحقیقت کوئی
معتد بہ کمال نہیں اور نہ اس کو اپنا مطمح نظر قرار دینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے
طریقوں کے باکمال اصحاب پر طریقۂ علیہ نقشبندیہ کے اکابر طریقت کو نمایاں تفوق
حاصل ہے اور ان کی نسبت[1] تمام دیگر مشائخ کی نسبتوں سے بلند اور برتر واقع

---

[1] تمام مقامات سلوک کو طے کر کے قلب عارف میں جو کیفیت ہمیشہ کے لیے راسخ و قائم

ہوئی ہے۔ خود اعیانِ طریقت کا قول ماثور یہی ہے کہ اِنَّ نِسْبَتَنَا فَوْقَ جَمِیْعِ النِّسَبِ (ہمارے اصول طریقت کی پیروی سے جو منتہائے کمال حاصل ہوتا ہے وہ سب طریقوں کے منتہائے کمال سے اعلیٰ و ارفع ہے) نسبت ایک اصطلاحی لفظ ہے جس سے مراد ان حضرات کے نزدیک دائمی طور پر حضور ذاتی (تجلی ذاتی) کا حاصل ہوتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان باکمال حضرات کے طریقہ میں اسی منتہائے کمال کو (جو دوسرے مشائخ کے نزدیک ناممکن اور ممتنع الوجود ہے) اول شروع طریقت ہی میں مطمح نظر رکھا جاتا ہے۔ یہ حالت ان کی اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ کی حالت کے مشابہ ہے۔ ان کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے ابتدا ہی میں وہ کمال حاصل ہو جاتا تھا جو دوسروں کو انتہا میں بھی شاذ و نادر میسر ہوتا ہے۔ اسی کو اندراج النہایۃ فی البدایۃ (آغاز میں عروج کمال) حاصل ہوتا جو دوسروں کو انجام سلوک پر نصیب ہوتا ہے کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت مخصوصہ کو دوسرے انبیائے عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ولایتوں پر شرف اور تفوق حاصل ہے اسی طرح حضرات نقشبندیہ قدس اللہ اسرارہم کی ولایت کو بھی دوسرے طریقوں کی ولایت پر ترجیح اور شرف ہے۔ کیوں نہ ہو انہی کا طریقہ تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ماخوذ ہے (جن کو باتفاق اہل سنت افضل الصحابہ کا جلیل القدر خطاب دیا گیا ہے) بے شک بعض دوسرے طریقوں کے مشائخ کو بھی مذکورہ بالا نسبت نصیب ہوئی ہے لیکن ان کو بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) رہتی ہے اور جو اس کے سلوک و عرفان کا نتیجہ اور ثمرہ ہے اسکو اصطلاح تصوف میں نسبت کہتے ہیں چنانچہ اس کتاب میں بھی تشریح کی گئی ہے لیکن یہ تشریح ایک خاص پہلو لیے ہوئے ہے یعنی یہ تعریف خصوصاً اس نسبت کی ہے جو طریقہ نقشبندیہ کا منتہائے سلوک ہے۔

یہ سعادت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے توسط اور انہی کے توسل سے حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ شیخ ابو سعید خراز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک موقعہ پر اس کا اظہار بھی فرمایا ہے۔ شیخ موصوف کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جبہ مبارک ملا تھا جسکی تفصیل مولانا جامی صاحب نے نفحات الانس میں لکھی ہے۔ طریقہ نقشبندیہ کی فضیلت بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ طالبان حق کو اس طریقہ علیہ کا فیض حاصل کرنے کی تشویق وتحریص ہو ورنہ اس کے کمالات کی تشریح کرنا مجھے کیا ضرور تھا۔ حضرت مولانا روم مثنوی شریف میں فرماتے ہیں

شرح او حیف است با اہل جہاں ہمچو راز عشق باید در نہاں	محبوب کے اوصاف وکمالات کی دنیا کے نااہل لوگوں سے تشریح وتوضیح کرنا نہایت افسوسناک بات ہے، اس کو عشق کے اسرار کی طرح چھپائے رکھنا ہی بہتر اور انسب ہے۔
لیک گفتم وصف او تا رہ برند پیش ازاں کز فوت آں حسرت خورند	بایں ہمہ میں نے اس کی کچھ نہ کچھ توصیف کر ہی دی کہ لوگ واقف ہو کر اسکی طرف متوجہ ہوں پیشتر اس کے کہ یہ گراں بہا موقعہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے اور وہ کف افسوس ملتے رہ جائیں

دوسرا مکتوب (۲۲)

(شیخ عبدالمجید فرزند شیخ محمد مفتی لاہوری کے نام لکھا گیا)

{روح اور نفس کے آپس میں تعلق کی وجہ۔ ان کے عروج و نزول کا بیان۔ فنائے جسدی اور فنائے روحی۔ بقائے جسدی اور روحی۔ دعوت کا مقام۔ اصحاب استہلاک اولیا اور وہ اولیا جو مقام دعوت کی طرف راجع کیے گئے ہیں ان کے درمیان فرق۔}

پاک اور بے عیب ہے وہ خدا جس نے نور اور ظلمت دو متضاد چیزوں کو یکجا کر دیا اور ایک جوہر لامکانی کو جو جہات ستہ سے کسی ایک جہت سے بھی منسوب نہیں جسم کے ساتھ اتصال دیا جو ہر طرح سے مکانی اور محدود بہ جہات ہے۔ اس نے اپنی قدرت کاملہ سے نور کو عاشق اور ظلمت کو اس کا معشوق بنا دیا جس نے اس کے ساتھ نہایت محبت کے ساتھ اختلاط کیا۔ اس عجیب و غریب تعلق و ارتباط میں یہ راز مضمر ہے کہ اول الذکر کی نورانیت اور بھی چمکے اور تاریکی کے ساتھ ہم آغوش ہو کر وہ اور زیادہ جوہر درخشندہ بن جائے۔ مثلاً جب ہم چاہتے ہیں کہ کسی آئینہ کو صیقل کریں اور وہ زیادہ شفاف اور مجلا ہو جائے تو اس کے منہ پر مٹی ملتے ہیں۔ اس کثیف اور ظلمانی عنصر کے ساتھ وصل پانے سے اس کی تمام کدورتیں اور کثافتیں زائل ہو کر وہ ایک ایسا جوہر تاباں بن جاتا ہے جس کو جام جہاں نما کہیں تو کچھ بیجا نہیں۔ اسی طرح روح کا جوہر نورانی جسد کے عناصر ظلمانی سے اتصال پا کر اور مزید روشنی حاصل کرتا ہے۔ (عالم غیب یا عالم ملکوت سے عالم شہادت میں

سلہ زمین و آسمان۔ بنی آدم اور حیوانات وغیرہ جو حواس بشری کے ادراک میں آسکتے ہیں عالم شہادت کہلاتا ہے لیکن جن اشیا کو حس ظاہری سے کچھ بھی تعلق نہیں اور جو محض نور عقل سے دریافت ہو سکتی ہیں ان کا نام عالم غیب ہے۔ مثلاً ملائکہ۔ جنت اور دوزخ وغیرہ خود حضرت انسان کی روح بھی

اُس کو اسی غایت اور نتیجہ کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس جوہر نورانی نے عالم شہادت میں آکر اور جسد ظلمانی کے ساتھ اتصال پاکر اس مقصود حقیقی کو فراموش کر دیا جو اس تعلق واتصال سے پہلے اس کو ملکوت میں حاصل تھا بلکہ اس جسم ہیولانی کے ساتھ اتنا ارتباط بڑھایا اور اس ظلمانی معشوق کے مشاہدہ جمال نے اس کو یہاں تک مبہوت کر دیا کہ وہ اپنی ذات کی حقیقت اور لوازم حقیقت کو بھول بیٹھا۔ مولانا روم صاحب رحمہ نے اسی مضمون کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے

مولوی گشتی و ناگہ نیستی　　　از کجا تا کجا و کیستی

اسی غفلت اور نسیان کی بدولت وہ اصحاب الشمال کے فریق سے جا ملا اور اسی ظلمانی معشوق کے ساتھ از حد وابستگی رکھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اصحاب الیمین کے کمالات سے وہ محروم اور بے بہرہ رہا۔ اگر بالفرض اس کو تمام زمانہ حیات میں یہ موقعہ نہ ملا کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنے مقصود اصلی کی طرف متوجہ ہو اور معشوق ظلمانی کے مفرط اور زائد از حد تعشق میں فنا نہ ہو کر اسی قدر تعلق و ارتباط رکھنے پر اکتفا کرے کہ جس غایت اور نتیجہ کے حاصل ہونے کے لیے یہ تعلق و ارتباط خالق عالم جل و علا نے قائم کیا ہے تو یقین کر لیجیے کہ اس کی حالت سخت قابل افسوس ہے کیونکہ وہ آفرینش انسان کے مقصود اصلی سے بھٹک گیا اور اپنی استعداد و کمالات کے جوہر نفیس کو اپنے نشہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اسی عالم غیب کا ایک جوہر ہے جس کو چند در چند حکمتوں کے لیے عالم شہادت میں بھیجا گیا ہے اور جس کا رجوع پھر عالم غیب کی طرف ہوتا ہے۔ سلوک اور تصوف کا مقصود یہی ہے کہ اس کو اپنا مقر اصلی یاد دلا کر عالم غیب کی طرف متوجہ کریں۔ یہ ایک نہایت طویل الذیل مضمون ہے جس سے علم تصوف و معرفت کی کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن ان کا پیرایہ بیان نہایت دقیق اور پیچیدہ ہے۔ حجۃ الاسلام امام غزالی رح کی کتاب احیاء العلوم اور حکیم الامۃ محمدیہ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ میں جستہ جستہ اس مضمون کی تشریح ملتی ہے۔

جہالت میں کھو بیٹھا اور اسی لیے وہ گمراہوں کے زمرہ میں داخل ہوا لیکن اگر عنایت ازلی نے اُس کا ساتھ دیا تو وہ ضرور حضیض جہالت سے سر اٹھانے کی کوشش کریگا۔ اپنے ضائع کردہ جوہر کو پھر ہاتھ میں لانے کے لیے یقیناً سعی بلیغ عمل میں لائیگا اور مقصود اصلی کی تلاش میں بزبان قال یا حال یہ شعر کہتا ہوا مشغول ہوگا ؎

اِلَیْکَ یَا مُنْیَتِیْ حَجِّیْ وَمُعْتَمَرِیْ	میرے حقیقی محبوب! میرے دل کی عین خواہش اور ارزو
اِنْ حَجَّ قَوْمٌ اِلٰی تُرْبٍ وَّاَحْجَارٖ	اگر لوگ مٹی اور پتھروں کا حج کریں تو کریں میرا حج اور میرا عمرہ تو تیری ہی محبت ہے۔

اگر وہ اس تگ و دو میں کامیاب ہوا۔ اگر دوبارہ اُس کو شہود قدسی میں بہترین وجہ پر وہی ملکوتی استغراق حاصل ہوا جو اس عالم تیرہ و تاریک میں قدم رکھنے سے پہلے حاصل تھا، اور وہ اپنی تمام تر توجہ کامل طور پر جناب قدس جلّ وعلا کی طرف منعطف کرنے کی نعمت عظمٰے سے بہرہ اندوز ہوا تو ایسی حالت میں وہ ظلمت انوار قدس سے مغلوب ہوکر مفقود و مضمحل ہوجاتی ہے۔ اگر یہ استغراق اس حد تک پہونچ جائے کہ وہ اپنے معشوق ظلمانی کو جس کے ساتھ اُس کا تعلق وارتباط ایک حکمت غامضہ پر مبنی ہے بالکل فراموش کردے۔ اپنے وجود اور توابع وجود تک کو بھلا دے۔ نورالانوار (یعنی نور ذات الٰہی تعالیٰ و تقدس) کے مشاہدہ میں وہ ازخود رفتہ ہوجائے اور اپنے مطلوب حقیقی کا حضور ذاتی (جو سلوک طریقت کی غایت اور منتہا ہے) بے پردہ حجاب اُس کو نصیب ہو تو کہیں گے کہ یہ صاحب سعادت فنائے جسد و روح کے

ا۔ جیساکہ پہلے ایک ذیلی حاشیہ کے ضمن میں لکھا گیا ہے یہ بات ضرور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نور وغیرہ الفاظ صرف تنگیٔ میدان عبارت کی وجہ سے لکھ دیے جاتے ہیں۔ ان سے محسوس نور کا توہم ہرگز نہ کریں۔ خداوند پاک جلّ وعلا کو جسمیت اور عوارض و اوصاف جسمیت سے مقدس اور برتر خیال کریں۔

رتبہ عالیہ سے فائز ہوا۔ اگر اس مرتبہ فنا کے حاصل ہونے کے ساتھ ہی اس کو اس
شہود قدسی میں بقا بھی میسر ہوئی تو سمجھ لیجئے کہ ولایت کے دونوں ضروری مراتب
اُس نے حاصل کر لیے۔ اس رتبہ تک پہونچ کر دو مختلف حالتیں پیش آیا کرتی ہیں
(۱) وہ اپنے مشہود تجلی جلّ و علا کے مطالعۂ ذات میں بالکل محو ہو جاتا ہے اور کسی وقت
بھی وہ ذات اقدس کے سوا غیر کی جانب ہرگز ہرگز توجہ والتفات نہیں کرتا۔
(۲) یہ کہ وہ منصب ارشاد و تکمیل پر مامور ہو کر عامۂ خلائق کو راہ حق کی طرف دعوت
کرنے میں مشغول ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا باطن تو شہود قدسی میں مصروف
رہتا ہے لیکن اُس کا ظاہر مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ مرتبۂ کمال پر فائز ہونے کی
صورت میں اُس عارف کا جوہر نورانی جس کی تمام تر توجہ مطلوب حقیقی پر محدود ہے
ظلمت متضادہ کے تقید سے مخلصی پاتا ہے اور اسی مخلصی کی بدولت وہ زمرۂ
اصحاب الیمین میں شامل ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ جوہر نورانی (جو درحقیقت ذات انسانی
اور عالم بالا سے اتری ہوئی روح مجردہ ہے) نفس الامر میں یمین وشمال (راست و
چپ) سے منسوب نہیں لیکن اظہار شرف و فضیلت کے لیے اس کو جانب یمین سے
منسوب کرنا ہی اولیٰ اور انسب ہے اور گو دراصل دونوں جوانب (یمین وشمال) اہل
چشم حقیقت بین کی نقاد نظروں میں یُمن اور برکت کا باعث ہیں (توہم پرستوں کے
خیال کے موافق کسی میں بھی نحوست نہیں) تاہم منبع خیرات ہونے کا مفہوم اوّل الذکر
لفظ کے ساتھ تعبیر کرنے سے زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ (اسی لیے ان باکمال لوگوں کو
بسبب اُن کے منبع خیرات وحسنات ہونے کے زبان شرع میں اصحاب الیمین
سے تعبیر کیا گیا ہے) جس طرح کہ ایک حدیث صحیح میں (جو صحیح مسلم میں عبداللہ
بن عمرو سے منقول ہے) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حق سبحانہ وتعالیٰ کا
ذکر مبارک فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا :-

وَكِلْتَا يَدَيْهِ يَمِينٌ ؎۱ ۔ الغرض اس حالت میں وہ جوہر نورانی ظلمت
جسمانی کی کدورتوں سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ ظلمت اس جوہر نورانی کے انوار کا اثر
قبول کرلیتی ہے جس سے اطاعت اوامر اور اداے حق عبودیت میں ایک عجیب
مدد ملتی ہے۔ اس جوہر نورانی لامکانی سے ہماری مراد روح انسانی بلکہ روح
کا بھی نقطۂ جوہریہ یا خلاصہ و زبدہ ہے اور ظلمت محدود بہ جہات اور منسوب
بہ مکان سے مراد نفس امارہ ہے۔ باطن و ظاہر کے الفاظ بھی انہی معنوں میں
استعمال ہوئے ہیں۔

یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جن اولیاء اللہ کو شہود قدسی اور مطالعۂ
ذات میں استغراق اور محویت حاصل ہو (جن کا بیان شق اوّل میں کیا گیا ہے) وہ
بھی تو احوال عالم سے مطلق بے خبر نہیں ہوتے۔ اُن کو تمام گردوپیش کے واقعات کا

؎۱ اس کے معنی یہ ہیں کہ حق جلّ وعلا کے دونوں ہاتھ یمین کے وصف سے موصوف
ہیں۔ ہاتھ کا لفظ جب خداے پاک جلّ وعلا کی طرف منسوب ہو تو اس سے جسمانی ہاتھ ہرگز
نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس قسم کے الفاظ جو قرآن و حدیث میں استعمال کیے گئے ہیں ان کو
متشابہات کہتے ہیں۔ ان کے متعلق علماے محققین کے دو بڑے مشہور مذہب ہیں۔ ایک تو
یہ کہ ان الفاظ کی حقیقت سمجھنے کے لیے زیادہ سر نہ کھپائیں، اجمالی طور پر ایمان لائیں اور
اسی قدر اعتقاد رکھنا کافی ہے کہ ان الفاظ کا جو کچھ بھی مفہوم ہے وہ حق ہے لیکن ظاہری
معنے ہرگز مراد نہیں۔ دوسرا یہ کہ ان الفاظ سے قاعدۂ استعمال مجاز کے مطابق ایک
خاص مفہوم لیا جائے جس کو عربی میں تاویل کہتے ہیں۔ پہلا مذہب جمہور اہل سنت کا
دوسرا قول معتزلہ اور بعض محققین کا ہے۔ زیادہ تفصیل مطلوب ہو تو امام غزالی رحمہ کی کتاب
الجام العوام وغیرہ مطالعہ فرمائیں۔

احساس ہوتا رہتا ہے اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ بھی گروہ ثانی کی طرح (جن کا بیان
شق دوم میں کیا گیا ہے) اختلاط اور میل جول رکھتے ہیں۔ اس لیے پہلے اور دوسرے
فریق میں بظاہر کوئی تفاوت معلوم نہیں ہوتا اور یہ ایک جواب طلب مسئلہ ہے
کہ اس استغراق اور توجہ بالکلیہ سے (جو فریق اول کا وصف لازم ہے) کیا مراد ہے؟
اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ استغراق اور توجہ بالکلیہ کا مطلب یہ نہیں کہ وہ عارف
دنیا و مافیہا کا احساس تک نہ کرے بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ نفس کی
خواص روح کے انوار سے مغلوب اور مضمحل ہو کر روح اور نفس دونوں ایک ساتھ
جناب قدس کی طرف متوجہ رہیں۔ باقی رہا احوال و کیفیات عالم کا احساس سو اس کا
تعلق انسان کے حواس خمسہ، جوارح (اعضا) اور قوائے جسمانی سے ہے جو
نفس کے لیے بمنزلہ فروع اور تفاصیل کے ہیں۔ الغرض ایسی حالت میں نفس تو
فیضانِ انوار روح سے مغلوب و متاثر ہو کر شہود غیبی کے مطالعۂ ذات میں بالکل محو
ہے لیکن اس کے فروع اور تفاصیل اپنے اپنے احساسات پر قائم ہیں جن میں کچھ
بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا اور اس لیے اس کے محسوسات اور وجدانیات عام لوگوں
کی طرح ہیں۔ لیکن فریق دوم (جن کو منصب ارشاد و تکمیل تفویض ہوتا ہے اور ان کو
مرجوع الی العالم کہتے ہیں) کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ان کا نفس اصلاح پا کر اور
مطمئنہ کا درجہ حاصل کر کے ہمیشہ کے لیے روح کے ساتھ شہود غیبی کے مطالعۂ

۵؎ نفس انسان کی تین مختلف حالتیں ہیں۔ اور ہر ایک حالت میں اس کا الگ نام ہے۔ پہلی حالت
یہ ہے کہ نفس پر صفات بہیمیہ اور سبعیہ کا غلبہ ہو اور وہ حق کی اطاعت سے بالکل گریز کرتا ہو۔ ایسے
نفس کو امّارہ کہتے ہیں۔ دوسری حالت میں اس کی کیفیت کچھ بین بین سی ہوتی ہے۔ ایک وقت
معصیت کا ارتکاب کرتا ہے لیکن دوسرے وقت خود پشیمان ہو کر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے۔ الغرض
کبھی تو وہ بندۂ شیطان ہوتا ہے اور کبھی بندۂ رحمان بن جاتا ہے۔ اس قسم کا نفس لوّامہ کہلاتا ہے۔

ذات میں مشغول نہیں رہتا بلکہ دعوت اور ارشاد کی غرض سے اُن انوار سے علیحدگی اختیار کرکے اہل عالم کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ اس عارف میں اور اون لوگوں میں جن کی تکمیل وارشاد کے لیے یہ عارف مامور ہے اچھی خاصی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے جو اُس کی دعوت حق کی قبولیت کا ایک بڑا بھاری ذریعہ ہے جو اس اور قوٰی کو بمنزلۂ تفاصیل نفس اس بنا پر قرار دیا گیا ہے کہ نفس کو قلب صنوبری[1] کے ساتھ ایک گونہ تعلق وارتباط ہے اور روح کا تعلق وارتباط بھی حقیقت جامعہ قلبیہ کے ذریعہ سے اسی قلب صنوبری کے ساتھ ہے اس لیے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تیسری حالت اس کی یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سرکشی چھوڑ کر خوشنودی الٰہی جل و علا کا بالکل مطیع ہو جائے۔ اور خداوند پاک تبارک وتعالیٰ کے احکام واوامر بجالانے میں اس کو لذت اور آرام حاصل ہو۔ اس حالت میں اس کا نام نفس مطمئنہ ہے۔

یہ تینوں نام قرآن کریم میں بھی متفرق مقامات پر مذکور ہوئے ہیں۔ صفات بہیمیہ، سبعیہ اور ملکیہ کی حقیقت تشریح وار سے مطلع ہونا چاہیں تو امام غزالی رح کے مقدمۂ کیمیائے سعادت کو ملاحظہ فرمائیں جس کا صاف وشستہ اردو میں بھی ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

[1] انسان کے بدن میں جو مضغۂ گوشت سینہ کے اندر موجود ہے اس کو قلب صنوبری کہتے ہیں لیکن جس طرح انسان درحقیقت اسی بدن کا نام نہیں بلکہ اُس میں عالم غیب کا ایک جوہر نورانی موجود ہے اور وہی حقیقی انسان ہے اسی طرح قلب صنوبری بھی حقیقۃً قلب نہیں۔ اسی قلب حقیقی کو امام صاحب نے حقیقت جامعہ قلبیہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ امام غزالی رح کی تحقیق کا ماحصل تو یہ ہے کہ روح، نفس، قلب اور عقل چاروں الفاظ اُس جوہر غیبی کے مختلف نام ہیں جو حقیقی انسان ہے۔ اس بحث کو امام غزالی رح نے احیاء علوم کی کتاب النفس میں نہایت تشریح وبسط کے ساتھ لکھا ہے لیکن حضرت مجدد صاحب کے نزدیک قلب، نفس اور روح کا مفہوم جداگانہ ہے جیسے کہ متن کی عبارت سے بھی صاف مترشح ہوتا ہے۔

جس قدر فیوض و انوار روح کی جانب سے جوارح اور قوے پر فائض ہوتے ہیں وہ سب نفس ہی کے توسط سے معرض ظہور میں آتے ہیں لہذا جوارح اور قوے کے محسوسات و مدرکات پہلے پہل نفس میں اجمالی طور پر ظہور پذیر ہو کر تا نیاً جوارح اور قوی میں تفصیلی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ بنا بریں یہ کہنا بالکل درست ہے کہ حواس اور قوے نفس کے لیے بمنزلہ فروع اور تفاصیل کے ہیں۔ اس تمام بسط و تفصیل سے ہر دو فریق میں جو مابہ الامتیاز ہے وہ واضح ہو گیا ہے۔ مزید برآں یہ بھی یاد رکھیں کہ پہلے فریق کے لوگ ارباب سکر ہیں[۱] اور دوسرے اصحاب صحو۔ اوّل الذکر کو شرافت حاصل ہے تو موخر الذکر فریق فضیلت سے بہرہ مند ہے۔ پہلے فریق کی حالت ولایت کی حقیقت سے مناسبت رکھتی ہے لیکن دوسرے فریق کو جو مقام حاصل ہوا ہے وہ مقام نبوّت کے مناسب حال ہے۔ بارگاہ کبریائے الٰہی تعالیٰ و تقدس سے التجا ہے کہ ہمیں اولیائے کرام کی کرامت سے مشرف فرما کر ساتھ ہی انبیاء عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی کامل متابعت نصیب کرے اور اس حالت پر قیام و ثبات عنایت فرمائے۔ راقم[۲] دعاگو کو اگرچہ بسبب عجمی ہونے کے عربی لکھنے میں چنداں مہارت نہیں تھی لیکن چونکہ آپ کا نامہ والا عربی میں تحریر کیا گیا تھا اس لیے عربی ہی میں جواب لکھنا مناسب معلوم ہوا۔

---

[۱] سکر کے لفظی معنے نشہ اور صحو کے معنے نشہ میں نہ ہونے کی حالت۔ اہل تصوف ان الفاظ کو مجازاً ذیل کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ جس عارف کو محبت الٰہی میں محویت حاصل ہو اور اس سے بے ساختہ ایسے اقوال یا افعال صادر ہونے لگیں جو خلاف شرع ہوں۔ ایسے بزرگوں کو ارباب سکر کہتے ہیں۔ اور ان کے فریق مقابل کو ارباب صحو۔

[۲] راقم سے مراد امام صاحب ہیں۔ وہ اپنے کو راقم کے لفظ سے لکھتے ہیں۔ اصل مکتوب شریف عربی میں لکھا گیا ہے۔

تیسرا مکتوب (۲۳)

(عبد الرحیم المشہور خان خاناں کے نام اس کے خط کے جواب میں لکھا گیا)

پیر ناقص سے اکتساب طریقت نہ کیا جائے۔ اس میں کیا مضرت ہے

اہل کفر کے مشابہ کوئی لقب اختیار کرنے کی ممانعت

خدائے پاک ہم کو اور آپ کو بحرمت سید البشر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام مقالِ خالی از حال اور علم بے عمل سے نجات بخشے۔ ویرحم اللہ عبداً قال آمیناً (خدائے تعالےٰ اس بندہ پر رحم فرمائے جس نے ازراہ ہمدردی ہماری اس دعا پر آمین کہہ دیا) آپ کا مکتوب برادر سعادت مند صداقت شعار نے پہونچایا اور ایک ترجمان کی حیثیت سے جو کچھ آپ نے فرمایا تھا بیان کیا۔ سن کر میں بے ساختہ یہ شعر زبان پر لایا

اھلاً لسعدی والرسول وحبذا	(میں نے اپنی معشوقہ اور اس کے قاصد کو مرحبا کہا اور
وجہ الرسول لحب وجہ المرسل	محبوبہ کی وجہ سے قاصد بھی کیسا پیارا معلوم ہوتا ہے)

میرے لائق اور ذی استعداد بھائی! خداوند تعالیٰ و تقدس آپ کے کمالات بالقوۃ کو

لہ مقال اور حال کا فرق خوب یاد رکھنا چاہئے۔ دوسرے مکتوبات میں بھی ان الفاظ کا اعادہ ہوگا۔ ایک شخص درد کے معنے زبان سے بیان کرتا ہے لیکن دوسرا خود اس حالت میں مبتلا ہے۔ پہلی حالت کا نام قال ہے اور دوسری حالت حال کہلاتی ہے۔ مزید توضیح کے لیے ایک اور مثال عرض کی جاتی ہے۔ قال یہ ہے کہ آدمی زبان سے شجاعت کی تعریف ماہیت کر دے اور اس کے متعلق لمبی چوڑی داستانیں بھی بیان کر سکے لیکن دل کی یہ کیفیت ہے کہ تلوار کو دیکھ کر رعشہ ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک دوسرا شخص ہے جو سینہ سپر ہو کر لڑتا ہے۔ اول الذکر کی شجاعت صرف قال سے تعلق رکھتی ہے اور دوسرے کو شجاعت کا حال حاصل ہے

لہ ۲ جس چیز میں ایک صفت کے حصول کی استعداد ہو لیکن ابھی وہ وصف معرض ظہور میں نہیں آیا

فعل میں لائے یہ سمجھ لیجئے کہ یہ دنیاوی زندگی تحصیل کمالات آخرت کے لیے ایک کھیتی ہے۔ اُس شخص کی حالت نہایت قابل افسوس ہے جو زمین استعداد کو معطّل چھوڑ کر اور اعمال صالحہ کی تخم ریزی سے غفلت کر کے کھیتی کا سامان ترک کر دے۔ یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ کھیت کی خرابی دو وجہ سے متصور ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اُس میں سرے سے کوئی بیج ہی نہ بویا جائے۔ دوسرے یہ کہ اُس میں خبیث اور زہردار جڑی بوٹیوں کا تخم ڈالا جائے جو بہ نسبت قسم اوّل کے اور بھی زیادہ مُضر اور خراب نتائج پیدا ہونیکا باعث ہے (یہ ایک استعارہ ہے۔ آیندہ فقرے میں امام صاحب نے اس کی توضیح فرمادی ہے) تخم کی خرابی سے یہ مُراد ہے کہ کسی پیر ناقص کو اپنا پیشوا مان کر اس کے نقش قدم پر چلیں چونکہ وہ پیر خود بندۂ ہوا و ہوس اور خواہشات نفسانی کا تابع ہے اس لیے اوّل تو اُس کی تلقین بے اثر ہوتی ہے لیکن اگر بالفرض کچھ اثر بھی کرے تو وہ اُلٹی تقویت ہوائے نفس کا موجب ہوگی جس سے بجائے روشن ضمیری کے تاریک دلی اور تیرہ اندرونی پیدا ہوگی۔ علاوہ اس کے پیر ناقص کو یہ بھی تو معلوم نہیں ہوتا کہ کونسا طریقہ موصل الی اللہ اور منزل مقصود تک پہونچانے والا ہے اور کونسا طریقہ غیر موصل اور باعث ضلالت و تباہی ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے یعنی یہ کہ وہ خود منزل مقصود تک نہیں پہونچا ہوتا۔ وہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ طالبانِ حق کی استعدادیں مختلف ہوتی ہیں اور اس لیے ہر ایک ارادت مند کو اُس کی استعداد کے موافق جداگانہ طریقہ پر تلقین کی جاتی ہے اس لیے وہ خدا کا بندہ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتا ہے۔ وہ اس امر سے بے خبر ہوتا ہے کہ جذبہ[ا] (سیر انفسی) اور سلوک (سیر آفاقی) کا طریقہ آپس میں بالکل مختلف ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تو کہیں گے کہ فلاں چیز میں فلاں خاصیت یا وصف بالقوہ موجود ہے۔ ظہور میں آنے کا نام بالفعل ہے۔ مثلاً ہر انسان بالقوہ عالم ہے لیکن بالفعل عالم ہونا صرف بعض افراد میں پایا جاتا ہے۔

[ا] جس طرح ہر ایک فن یا علم کے حاصل کرنیکا ایک خاص طریقہ ہوتا ہے اسی طرح معرفت الٰہی کے

اور بسا اوقات ایک طالبِ حق کی استعداد کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ واصل بحق ہونے کے لیے اُس کو طریقِ جذبہ کی رہنمائی کی جائے کیوں کہ طریقِ سلوک پر چلنے کے لیے اس کی فطرت میں مناسبت نہیں۔ پیرِ ناقص ناواقفیتِ اصول طریقت اور استعداد شناس نہ ہونے کی وجہ سے اُس کو طریقِ سلوک پر چلاتا ہے جو اُس کے حق میں خلافِ فطرت ہونے کے باعث اُس کے لیے اور بھی موجب ضلالت ہوتا ہے۔ اُن کے حال پر یہ آیت کریمہ بالکل صادق آتی ہے۔ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا (وہ لوگ خود تو پہلے سے گمراہ تھے اپنے تئیں کامل تصور کرکے دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی گمراہ کر دیا) اب اگر کوئی ایسا ہی طالب حق جس کی استعداد کو پیرِ ناقص نے غلط راستہ پر لگا کر اور بھی خراب کر دیا ہو کسی پیرِ کامل کے زیرِ تربیت آنا چاہے تو اُس کے روبراہ کرنے میں پیرِ کامل کو بہت کچھ زحمت اٹھانی پڑےگی۔ سب سے مقدم بات جو اُسے کرنی ہوگی یہ ہے کہ جو کچھ خرابی پیرِ ناقص کی غلط تعلیم و تربیت سے پیدا ہوئی ہے اُس کے زائل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ازاں بعد اُس کی استعداد کی تشخیص کے موافق اُس کی تربیت میں مشغول ہو۔ حسب دلخواہ برگ و بار پیدا کرنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ زمین ہی کی استعداد کے موافق اور تمام گرد و پیش کے حالاتِ آب و ہوا وغیرہ کو مدنظر رکھ کر اصول زراعت کے مطابق درست طور پر تخم ریزی کی جائے۔ خود خداوند پاک جل و علا نے اس مضمون کو نہایت خوبی اور وضاحت کے ساتھ سورۂ ابراہیم میں بیان فرمایا ہے۔ قال اللہ تبارک و تعالیٰ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) حصول کے لیے بھی مختلف بزرگان طریقت اور ائمہ حقیقت کو مختلف اصول کا الہام ہوا۔ امام صاحب کے نزدیک حصول معرفت کے دو طریقے ہیں ایک تو وہ جذبہ یا سیر انفسی کے نام سے موسوم فرماتے ہیں۔ دوسرے طریقہ کا نام انھوں نے سلوک یا سیر آفاقی رکھا ہے۔ مختلف مکتوبات میں اس کا مفصل حال بھی بیان کیا گیا ہے۔

مَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ

(پاک کلمات (اور پاک تعلیم و تربیت) کی مثال ایک پاکیزہ درخت کی ہے جس کی جڑ تو زمین میں نہایت مضبوط طور پر گڑی ہوئی ہے اور اُس درخت کی شاخیں فضا ہوا میں دور تک چلی گئی ہیں۔ خدا کے حکم اور ارادے سے ہر ایک ایسے وقت میں جو اُس کے پھل لانیکا موسم ہے وہ برابر اپنا پھل دیتا ہے خداوند پاک جل و علا اسی طرح لوگوں کو سمجھانے کیلئے تمثیلیں بیان فرمایا کرتا ہے۔ لیکن خبیث کلمات (اور خبیث و غلط تعلیم و تربیت) کی مثال ایک مُضر اور زہریلے درخت کی ہے جو اس قابل ہے کہ اُسے زمین پر سے اکھیڑ لیا جائے (اہل حق کے نزدیک اس کا کچھ بھی ٹھکانا نہیں۔ فوراً اُس کا استیصال کر دینا چاہیے)

الغرض پیر کامل کی صحبت میں رہنا اکسیر اعظم ہے۔ اُس کی ایک نظر امراض باطنی کی دوا ہے اور اُس کا ایک ایک لفظ درد ہائے اندرونی کے لیے شفا ہے لیکن پیر کامل کی رہنمائی کیے بغیر منزل مقصود کو پہونچنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ خداوند پاک جل و علا ہمیں اور تمھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت پر ثبات و استقامت نصیب فرمائے۔ تمام کمالات و مراتب عالیہ کی بنیاد اور نجات و سعادت کا مدار یہی شریعت غرّا محمدی ہے علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کسی فارسی شاعر نے اس مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ ؎

محمد عربی کآبروئے ہر دو سرا ست — کسیکہ خاک درش نیست خاک بر سرِ او

والصلوٰۃ والسلام علی حبیبہ وصفیہ محمد سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

تتمۂ مکتوب۔ برادر مکرم نے یہ بھی اثنائے کلام میں بیان کیا کہ آپ کے بار یاب شعرا میں ایک نامور شاعر ہیں جنھوں نے اپنا تخلص کفری قرار دیا ہے۔ یہ شاعر

سادات کے ایک معزز خاندان کے رکن رکین ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ انھوں نے ایسا قبیح اور مذموم لقب اپنے لیے کیوں اختیار کیا ہے جس کی قباحت اظہر من الشمس ہے۔ ہر ایک مسلمان کو مناسب ہے کہ ایسا مذموم لقب اختیار کرنے سے کوسوں دور رہے۔ ایک مسلمان کو یہ خطاب ناصواب شیر گردن شکن کے حملہ سے زیادہ مہیب نظر آنا چاہیے اور سچا مسلمان ہونے کی یہی علامت ہے کہ وہ اس مکروہ لفظ کو سخت ناگوار اور قابل نفرت خیال کرے۔ یہ لفظ اور اس کا مفہوم دونوں خدائے برتر اور اس کے رسول برحق کے نزدیک نہایت ہی مبغوض ہیں۔ مسلمانوں کو عام طور پر حکم دیا گیا ہے کہ وہ اہل کفر کو دشمن سمجھیں اور ان کے ساتھ درشتی کا برتاؤ کریں (چہ جائیکہ خود اپنے تئیں صریح لفظوں میں کفر سے منسوب کیا) اس لیے نہایت ضروری ہے اور مؤکد فرض ہے کہ ایسے قبیح اور مذموم لقب سے اجتناب کیا جائے۔

ایک ظاہر بین اعتراض کر سکتا ہے کہ بعض مشائخ عظام قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم نے بھی بعض وقتوں میں کفر کی مدح سرائی فرمائی ہے اور کفر کے خاص شعار زنار بندی کے لیے ترغیب و تحریص کی ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اس قسم کے کلمات ان حضرات سے غلبۂ سکر کی حالت میں سرزد ہوئے ہیں اور اس لیے ان کو ظاہری معنوں پر محمول نہیں کرنا چاہیے بلکہ تاویل کر کے صحیح مطابق عقل و شرع معنی لینے چاہئیں۔ اہل سکر کا کلام ہمیشہ اسی طرح مصروف عن الظاہر (جو ظاہری معنوں پر محمول نہ ہو) ہوا کرتا ہے اور وہ حضرات ارباب سکر غلبۂ سکر کی وجہ سے اس قسم کے کلمات زبان پر لانے میں معذور تصور کیے جاتے ہیں۔ بایں ہمہ اکابر طریقت نے تصریح فرما دی ہے کہ علم حقیقت کے اصطلاحی کفر و اسلام کا بھی اگر موازنہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اسلامِ حقیقت کو

کفر حقیقت پر ترجیح حاصل ہے اور مؤخر الذکر ایک ناقص اور مذموم وصف ہے۔ گو وہ خود غلبۂ حال کے باعث معذور اور ناقابلِ ملام وعتاب ہیں مگر جو لوگ اُس حال اور مقام سے معرا ہو کر بھی اُن کی کورانہ تقلید کرتے ہیں وہ اہل شرع اور ارباب طریقت دونوں کے نزدیک معذور نہیں ہیں (ازیں سو رانده وازیں سو درمانده) ہر ایک چیز کے لیے ایک خاص وقت اور موقعہ ہوتا ہے اور اُس وقت خاص یا موقعہ مخصوصہ سے اگر الگ کر کے اُس کو دیکھا جائے تو اُس کی قباحت محتاج بیان نہیں (بچہ اگر تتلا کر بولے تو اُس کا یہ بولنا کیسا پیارا اور دلکش معلوم ہوتا ہے لیکن اگر بڑا آدمی اُس کی تقلید کرے تو کس قدر برا معلوم ہوتا ہے) ایک قسم کو دوسری پر محمول کرنا قانونِ قیاس سے بعید ہے اور کوئی عقلمند ایسا ہرگز نہیں کریگا

میری طرف سے اس سید صاحب سے التماس کیجیے کہ وہ اس قبیح تخلص کو بدل ڈالیں اور اس کی بجائے کوئی اچھا لقب اپنے لیے اختیار کریں بلکہ میری رائے میں وہ اپنا تخلص "اسلامی" کریں تو نہایت زیبا ہے۔ یہ تخلص ایک مسلمان شخص کے حال اور قال کے بالکل موافق ہے۔ اس میں مذہب مقدس اسلام کی طرف انتساب پایا جاتا ہے جو خداوند پاک جل وعلا اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پسندیدہ ترین طریقہ ہے۔ تہمت خواہ کتنی ہی بے محل کیوں نہ ہو حتی الامکان اُس سے احتراز کرنا ضروری ہے اور شرعًا ہم مامور ہیں کہ اُس سے اجتناب کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اِتَّقُوْا مَوَاضِعَ التُّهَمِ (تہمت کی جگہ سے پرہیز کرتے رہیں) کلام پاک میں ہے۔ قال اللہ تبارک وتعالیٰ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ۔ ایمان دار غلام مشرک (کافر) آقا سے بہت بہتر ہے۔

والسلام علے من اتبع الھدے۔

چوتھا مکتوب (۲۴)

(محمد قلیچ خاں کے نام لکھا گیا)

صوفی کائن بھی ہے اور بائن بھی۔ ایک سے زیادہ محبوبوں سے وہ وابستگی نہیں ہوسکتی۔ محبت ذاتیہ کے رونما ہونے پر محبوب کا انعام و ایلام یکساں معلوم ہوتا ہے۔ مقربین اور ابرار کی عبادت کا فرق۔ اولیاء مستہلکین اور مرجوعین کا فرق۔

خداوند پاک جل و علا بحرمت سید المرسلین صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کو سلامتی اور عافیت سے رکھے۔ صحیحین (بخاری اور مسلم) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے۔ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (جس کے ساتھ محبت ہوگی اُسی کی معیت اور رفاقت نصیب ہوگی) اس لیے سب سے زیادہ قابل تعریف وہی شخص ہے جس کے دل میں محبت الٰہی جل و علا کے بغیر اور کسی چیز کی محبت کی سمائی نہ ہو۔ اپنے مولائے پاک تعالیٰ وتقدس ہی کی خوشنودی اُس کا مطمح نظر اور نصب العین ہو۔ ایسا شخص ہر وقت معیت الٰہی جلّ و علا کی سعادت عظمے سے بہرہ اندوز رہتا ہے اگرچہ وہ بظاہر مخلوق کے ساتھ رہ کر صوری طور پر معاملات خلق میں بھی کیوں نہ مشغول ہو۔ یہ اُس مرد با خدا کی حالت ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ الصوفی کائن بائن (صوفی باصفا کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ساتھ بھی ہے اور جدا بھی) اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ خداوند پاک جلّ و علا کے تو ساتھ ہے لیکن لوگوں سے جدا ہے یا یہ کہ اُس کا ظاہر لوگوں کے ساتھ ہے اور حقیقت میں وہ اُن سے جدا ہے۔ یہ ایک صاف بات ہے کہ دل کا قبلہ محبت ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اگر اس کا قبلہ محبت درحقیقت خالقِ عالم جلّ و علا ہے تو ممکن نہیں کہ مخلوق اُس کے دل میں گھر کرسکے۔ بعض اوقات قاعدہ مذکورہ بالا پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایک شخص کو متعدد اور مختلف چیزوں سے محبت ہوتی ہے مثلاً وہ مال کو بھی چاہتا ہے۔

اولاد سے بھی اس کو محبت ہے۔ بیوی سے بھی وابستگی ہے۔ جاہ و منصب کا بھی خواہاں ہے۔ مدح اور رفعت کا بھی دل سے متمنّی ہے۔ اس قسم کی مثالیں دیکھکر یہ قاعدہ نہایت مشکوک ہوجاتا ہے کہ "دل کا قبلۂ محبت ایک ہی ہو سکتا ہے"۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں حقیقت حال یہ ہے کہ اس صورت میں بھی اُس کا قبلۂ محبت ایک ہی ہے یعنی اپنا نفس اور اپنی ذات اُس کا محبوب ہے اور ان سب مختلف چیزوں کو وہ اپنی ذات کے لیے چاہتا ہے۔ یہ سب چیزیں محبوب بالعرض و مقصود بالواسطہ ہیں اور در حقیقت اُس کا قبلۂ محبت صرف ایک ہی ہے جو اُس کا اپنا نفس ہے۔ اگر بالفرض ان چیزوں کا تعلق اوسکے نفس سے قطع ہوجائے یا سرے سے اوس کو اپنے نفس کے ساتھ محبت ہی نہ رہے تو یہ رشتۂ الفت خود بخود منقطع ہوجائیگا۔ اسی نکتہ کو ملحوظ رکھکر اور اسی اصول کی بنا پر عارفان راہ شناس نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "خدا اور بندے کے درمیان جو حجاب[1] حائل ہے وہ بندے کا اپنا نفس ہے۔ عالم کو کیا مجال کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان حائل ہوسکے"۔ یہ اس لئے فرمایا کہ دنیا و مافیہا کسی حالت میں بھی محبوب بالذات نہیں اور جو چیز محبوب بالذات نہو وہ کس طرح چہرۂ مقصود کا حجاب ہو سکتی ہے۔ چونکہ بندہ کا مقصود بالذات اور محبوب حقیقی اوس کا اپنا ہی نفس ہے اس لئے اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ یہی ایک بڑا حجاب ہے لہٰذا جب تک انسان اپنے نفس کی محبت اور گرفتاری سے بالکل آزاد نہو خداوند پاک جلّ و علا کی محبت اوس کے دل میں (جو غیر اللہ کی محبت سے ملوث ہے) نہیں سما سکتی۔

یہ سعادت عظمےٰ (یعنی محبت الٰہی جل و علا بطریقۂ محبت ذاتی) تب ہی متحقق ہوسکتی ہے جبکہ پہلے فنائے کامل حاصل ہو جس کا حصول تجلی ذاتی کے رونما

---

[1] ہر ایک چیز جو حصولِ مقصود کے لئے مانع اور سنگ راہ ہو اس کو مجازاً حجاب ہی کہتے ہیں۔

ہونے پر موقوف ہے۔ اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔ جبتک آفتاب عالم افروز
جلوہ گر ہو تاریکی کا بالکل معدوم ہو جانا متصوّر ہی نہیں۔ جس وقت یہ محبّت ذاتیہ
ظہور میں آتی ہے محبوبِ حقیقی کا انعام و ایلام (نعمت اور تکلیف) یکساں معلوم ہوتا ہے
اور ہر ایک حالت میں وہ شرابِ محبت کے نشہ میں سرشار رہتا ہے (تکالیف کو بھی
محبوب کا تحفہ سمجھتا ہے اور اسلئے اوس کو مطلق رنج نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ارادوں
سے بالکل علیحدہ ہو کر محبوب حقیقی کے ارادہ کو ہر ایک چیز پر ترجیح دیتا ہے) اسی
مقام پر پہونچکر کامل اخلاص کا رتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اوس کی عبادت خالصًا للّٰہ
ہوتی ہے۔ جس میں مرادِ نفس کی کچھ بھی آمیزش نہیں پائی جاتی اور جلبِ منفعت یا
دفع مضرت کا خیال کچھ بھی مدّ نظر نہیں رہتا۔ کیونکہ محبت ذاتیہ کی وجہ سے وہ اپنے
محبوب کی تنعیم و تعذیب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس رتبہ پر فائز ہو کر انسان
مقرّبین کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان سے کمتر درجہ ابرار کا ہے جن کی عبادت
خوفِ عذاب اور توقعِ ثواب پر مبنی ہوتی ہے۔ اون کی عبادت کا مآل اپنے نفس
کی اغراض کا پورا کرنا ہوتا ہے (فجّار اور ابرار میں فرق صرف اتنا ہے کہ گروہ اول الذکر
کی نظر دنیاوی حظوظ تک محدود ہے لیکن ابرار اون کی بہ نسبت کسیقدر عالی نظر
ہیں اور وہ اپنے لئے آخرت کی نعمتوں کے خواہان و جویان ہیں۔) جس کی وجہ یہ ہے
کہ وہ محبت ذاتیہ کی چاشنی سے لذّت آشنا نہیں ہوئے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہہ ہے کہ
ابرار کی حسنات[1] (نیکیاں) مقربین کے حق میں سیّآت (برائیاں) ہوں۔ ابرار کی

---

[1] یہاں ایک زبردست اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک عمل ایک شخص کیلیے
تو موجب ثواب ہو لیکن وہی عمل دوسرے شخص کے لئے عتاب اور عذاب کا باعث ٹھہرے
ہم اس موقع پر ناظرین کتاب ہذا کی توجہ ایک ایسے واقعہ کی طرف منعطف کرنا چاہتے ہیں جو مجمل
طور پر قرآن کریم میں بھی مذکور ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے جب دیکھا کہ قوم پیغام آلہی کی

نیکیاں ایک حیثیت سے تو حسنات ہیں لیکن دوسری حیثیت سے سیّآت میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ برخلاف اس کے مقربین کی نیکیاں خالص حسنات ہیں اور اون میں کسی طرح بھی برائی کا پہلو نہیں نکلتا۔ بے شک بعض مقربین جب وہ فنائے تام کے بعد بقائے کامل کی سعادت سے مشرف ہوتے اور عالمِ اسباب کی طرف رجوع

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) اطاعت کرنے سے گریز کرتی ہے اور شرک و کفر کو چھوڑنے پر مائل نہیں۔ تو اونہوں نے محض دین و ایمان کے نقطۂ نگاہ سے اُن دشمنانِ خدا میں رہنا پسند نہ کیا اور وہاں سے چلے گئے۔ اس پر اون کو جو کچھ بارگاہ الٰہی سے عتاب ہوا اور جس طرح اون کو چالیس دن یا کم و بیش زمانہ تک مچھلی کے پیٹ میں تادیبًا رکھا گیا اوس سے بہت کم مسلمان ناواقف ہوں گے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اگرچہ دشمنانِ خدا کے ساتھ بغض رکھنا اور حتے الامکان اون سے دور رہنا عام اہل ایمان کے لئے نہایت ثواب کا کام ہے جس کو زبانِ شرع میں بغض فی اللہ کہتے ہیں اور آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو افضل الاعمال کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ لیکن ایک پیغمبر (جس کو ہر ایک واقعہ میں وحی کے ذریعہ حکم ناطق حاصل ہو سکتا ہے) کے علو منصب کے شایان شان یہ ہے کہ وہ ہر ایک حالت میں اشارہ الٰہی جل و علا کا منتظر رہے۔ چونکہ حضرت یونس علیہ السلام نے صریح حکم ملنے کا انتظار نہ کیا اس لئے ان کو سخت عتاب کیا گیا اور آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہوا کہ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ (تو مچھلی والے پیغمبر کی طرح جلد بازی نہ کر) یقینًا اب آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا کہ کس طرح افضل الاعمال مقربان خدا کے حق میں سیّآت میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اس کی بیسیوں مثالیں بیان کی جا سکتی ہیں۔ لیکن طوالت کا خیال مانع ہے۔ بہر حال یہ ایک نہایت سچا قول ہے کہ حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِينَ (ابرار لوگوں کی نیکیاں مقربین کے حق میں سیّآت ہیں) جس میں اعتراض کی ہرگز گنجائش نہیں۔

کر کے دعوتِ خلق میں مشغول ہوتے ہیں تو ایسی حالت میں اون کی عبادت
بھی بیم و رجا پر مبنی ہوتی ہے لیکن یہ خوف و رجا اپنے لئے حصول ثواب یا دفع
عذاب کا باعث نہیں بلکہ اوس کا مآل بھی محبوب حقیقی جل و علا کی خوشنودی
یا عدم خوشنودی ہوا کرتی ہے۔ جنت کی طلب ہے تو صرف اسلئے کہ وہ
رضائے الٰہی جلّ و علا کا مظہر ہے نہ اسلئے کہ وہ حظوظ نفسانی سے متمتع ہونے
کا ایک نادر موقع ہے اور اگر دوزخ سے ڈر کر اوس سے بچنے کی کوشش
کرتے ہیں تو بھی اوس کی یہی وجہ ہوتی ہے کہ وہ قہر و غضب الٰہی تعالیٰ و تقدس
کے ظہور کا مقام ہے۔ یہ مدّ نظر نہیں کہ اپنے تئیں عذاب کی تکلیف سے بچائیں
یہہ بزرگوار جن کو مقربین کہتے ہیں حظوظ نفس کی طوق غلامی سے رہائی پاچکے
ہیں اور اون کا ظاہر و باطن خالص اپنے مولائے پاک جلّ و علا کی خوشنودی
حاصل کرنے کیلئے وقف ہوچکا ہے (اسی وجہ سے اون کو کلام پاک میں مختلف
موقعوں پر عباد اللہ المخلصین سے تعبیر فرمایا گیا ہے) یہہ رتبہ جس میں فنائے تام
کے بعد بقائے دوام حاصل ہوتی ہے مراتب مقربین میں بھی ایک اعلےٰ ترین مقام
ہے۔ اس مرتبۂ عالیہ پر جو سعادتمند فائز ہو اوس کو علاوہ اس کے کہ ولایت خاصّہ
کے شرف سے بہرہ ور ہو اوس کو کمالاتِ نبوّت سے بھی حظِّ وافر حاصل ہوتا ہے
لیکن جس عارف کو یہ مرتبہ رجوع الی الخلق کا نصیب نہو اور اوس کو عالم اسباب
میں واپس نہ لایا جائے وہ اون اولیائے کرام کے زمرہ مین محسوب ہوتا ہے جن کو
اولیائے مستہلکین کہتے ہیں (وہ اولیا جن کو فنا کا مقام حاصل ہو لیکن بقا سے
مشرف نہوئے ہوں) یہ فریق کمالات نبوّت سے بے بہرہ رہتا ہے اور اسلئے
وہ فریق اول کی طرح اس قابل نہیں ہوتا کہ تکمیل و ارشاد کا جلیل القدر منصب
اُن کو تفویض ہو۔ بالآخر بارگاہ الٰہی تعالیٰ و تقدس سے دعا ہے کہ ہمیں بھی

آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقہ میں انہی بزرگواروں کے ساتھ محبت رکھنا نصیب کرے کیونکہ خود آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (جسکے ساتھ محبت ہوگی اوس کی معیت اور مرافقت نصیب ہوگی۔) والسلام اولاً و آخراً۔

پانچواں مکتوب (۲۵)

(خواجہ جہان کے نام لکھا گیا)

"آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی متابعت کی ترغیب وتحریص"

خداوند پاک جل وعلا آپ کو قلب سلیم عنایت کرے انشراح صدر مرحمت فرمائے تزکیۂ نفس کی توفیق بخشے اور نرم دلی کے محمود وصف سے آراستہ فرمائے ان سب مطالب کا حصول بلکہ روح[1] سر خفی اور اخفٰے کے تمام کمالات کا معرض ظہور میں آنا سید الانبیا حضرت محمد مصطفٰے احمد مجتبٰے صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

[1] امام صاحب کے نزدیک انسان میں پانچ جواہر غیبیہ ودیعت رکھے گئے ہیں جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ قلب۔ روح۔ سر خفی۔ خفی۔ انہی کو لطائف انسانی اور لطائف خمسہ کہتے ہیں۔ یہہ پانچوں جواہر عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہی جواہر کی تہذیب اور تزکیہ تصوف کا لب لباب ہے۔ امام صاحب نے بعض دوسرے مکتوبوں میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کا بیان فرمایا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک مستقل کتاب اس موضوع پر لکھی ہے جس کا نام اونہوں نے "الطاف القدس" رکھا ہے۔

پیروی اور اتباع پر موقوف و منحصر ہے۔ اسلئے ضرور ہے کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اوس کے خلفائے راشدین کے طریقۂ راشدہ کا اتباع کریں۔ فلک ہدایت کے نجوم زواہر (ستارہ ہائے روشن) انہی کو کہنا بجا ہے اور عالم ولایت کے شموس بواہر (آفتاب عالمتاب) سے انہی کو مخاطب کرنا زیبا ہے جس کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دی گئی اوس نے غایت درجہ کی کامیابی حاصل کی اور جس نے اون کی مخالفت کی وہ چاہ ضلالت کے عمیق گڑھے میں جاگرا۔ حرف مطلب یہ ہے کہ شیخ سلطان مرحوم کے دونوں فرزند نہایت فاقہ و فقر کی حالت میں ہیں۔ آپ کو خداوند پاک جلّ و علا نے اس قابل بنایا ہے کہ اہل احتیاج کی دستگیری فرمائیں۔ التماس یہ ہے کہ مذکورین کی اعانت سے دریغ نہیں فرمائینگے۔ خدا تعالےٰ وتقدس آپکو توفیق خیر عنایت فرمائے۔ والسلام علےٰ من اتبع الہدےٰ ۔

(شیخ حاجی محمد لاہوری کے نام لکھا گیا)

شوق ابرار سے مخصوص ہے۔ مقربین میں یہہ وصف نہیں ہوتی۔ وغیرہ وغیرہ

خداوند پاک جلّ و علا ہمیں اور تمہیں آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کے صراط مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ حدیث قدسی ہے کہ

اَلَا طَالَ شَوْقُ الْاَبْرَارِ اِلٰی لِقَائِیْ وَ اَنَا اِلَیْهِمْ لَاَشَدُّ شَوْقًا	"ضرور ابرار کا شوق مجھ سے دوچار ہونے کیلئے بڑھا ہوا ہے لیکن مجھ کو اون سے ملنے کا اور بھی زیادہ شوق ہے"

اس حدیث قدسی میں خداوند پاک جلّ و علا نے ابرار کیلئے شوق کا مفہوم ثابت فرمایا ہے کیونکہ مقربین میں یہ صفت نہیں پائی جاتی۔ شوق صرف اوس صورت میں دامنگیر ہو سکتا ہے جبکہ مقصودِ دل حاصل نہو لیکن مقربین اپنے محبوب حقیقی سے وصل حاصل کر چکے ہیں اسلئے اُن کے حق میں شوق کا تصوّر ہی نہیں ہو سکتا۔ یہہ ایک بدیہی بات ہے کہ کوئی شخص اپنے حق میں اظہار شوق نہیں کرتا حالانکہ سب سے زیادہ محبوب اپنی ذات ہے۔ وجہ یہ کہ شوق پیدا ہوتا ہے محبوب کی مباعدت سے۔ (جب محبوبِ دل کو نہ پانے کی وجہ سے اسکے ملنے کے لئے جی للچاتا ہے تو اس حالت کو شوق کہتے ہیں) اور اپنی ذات سے اس کو کسی حالت میں مباعدت یا ہجران نہیں۔ وہ عارفِ مقرب جو اپنے نفس سے فانی ہو کر بقا باللہ کے درجہ سے مشرف ہوتا ہے اس کی مثال بعینہٖ یہی ہوتی ہے۔ اسلئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کو محبوب حقیقی کا شوق ہے۔ ابرار کو چونکہ ابھی وصلِ محبوب کی سعادت میسّر نہیں ہوئی لہذا وہ بے تابی کے ساتھ اس مقام کے حصول کے لئے سخت منتظر اور چشم براہ ہیں اسی حالت کا نام شوق ہے اور یہہ ان کی وصفِ مخصوص ہے۔ جس عارف کو ابھی حقیقتِ وصل حاصل نہیں ہوئی خواہ وہ سلوک کے ابتدائی منازل طے کر رہا ہو یا درمیانی مراحل کے عبور کرنے میں مشغول ہو بہرکیف جبتک حصولِ وصل میں کچھ بھی رکاوٹ حائل ہے وہ دائرۂ ابرار سے خارج ہو کر زمرۂ مقربین میں شامل نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی آتشِ اشتیاق میں کسی طرح کا فرق نمودار ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

کسی فارسی شاعر نے اس مضمون کو کس خوبی اور صفائی سے ادا کیا ہے ؎

فراق دوست اگر اندک است۔ اندک نیست

درون دیدہ اگر نیم مو است بسیار است

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالے عنہ سے منقول ہے کہ اونہوں نے ایک شخص کو

دیکھا کہ قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہے۔ آیات قرآنیہ کے پڑھنے کا اسکے بے چین دل پر بجلی کا سا اثر ہوتا ہے اور بے اختیار اسکے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ حضرت صدیق رضی نے اس حالت کو دیکھکر فرمایا۔ هٰكَذَا كُنَّا نَفْعَلُ وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُنَا۔ (ہماری بھی کسی زمانہ میں یہی حالت تھی لیکن اب تو ہم سنگدل ہو گئے) صدیق اکبر رضی نے اس قول میں المدح بما یشبہ الذم[1] کا محاورہ استعمال فرمایا ہے۔ میں نے اپنے پیرو مرشد خواجہ باقی باللہ قدس سرہ العزیز کو ایک مرتبہ یہہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ "بعض اوقات راہ سلوک کا منتہی جس کو مقام وصل میسر ہوتا ہے یہہ آرزو کرتا ہے کہ اوس کو وہی گرمی طلب اور اشتیاق حاصل ہو جس کی بھڑک ابتدائے سلوک میں اوس کے اندر شعلہ زن رہتی تھی"

صفت شوق کے مفقود ہو جانے کے لئے ایک اور مقام بھی ہے جو اس بیان کردہ مقام سے اکمل وارفع واقع ہوا ہے۔ وہ یاس (مایوسی) اور عجز عن الادراک (دریافت حقیقت سے عاجز ہونا) کا مقام ہے۔ اس مقام میں بھی شوق کا وجود ناممکن ہے کیونکہ شوق جب ہی متصوّر ہوتا ہے کہ حصولِ مقصود کی توقع ہو لیکن جب توقع ہی باقی نہیں رہی تو شوق کیسا۔ اس قسم کا عارف کامل جب تکمیل و ارشاد کے لئے عالم کی طرف رجوع بھی کرتا ہے تو گو اس رجوع کی حالت میں وہ محبوب حقیقی سے مہجور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس ہجران کی حالت میں بھی اُس میں صفت شوق ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کا شوق اس وجہ سے زائل نہیں ہوا تھا کہ وہ بلائے ہجراں میں مبتلا تھا بلکہ زوال شوق کی علت اصلی حصول یاس تھا جو اب بھی موجود ہے لیکن پہلے قسم کا باکمال عارف جس کے زوال شوق کا باعث حصول وصل محبوب ہے جب عالم کی طرف رجوع کرتا ہے تو اسکا

[1] "المدح بما یشبہ الذم" یعنی کسی چیز کی تعریف و مدح ایسے الفاظ میں بیان کرنا جس سے بظاہر ہجو اور مذمت کا پہلو نکلتا ہو۔ یہہ بھی ایک صنعت ہے جس سے کلام میں خوبی پیدا کرنا

سینہ دوبارہ گرمیٔ شوق سے بھڑک اوٹھتا ہے۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔
وصل محبوب جس کے باعث شوق زائل ہوگیا تھا مفقود ہوجاتا ہے جس کا لازمی
نتیجہ یہہ ہے کہ پھر آتش شوق شعلہ زن ہو۔ یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ
چونکہ وصول کے مراتب بے شمار ہیں اسلئے یہ ممکن نہیں کہ شوق کا سلسلہ منقطع ہو۔
وصل کا ایک مقام حاصل کرکے دوسرے مقام کے حصول کیلئے جو اوس سے
بالاتر ہے ضرور شوق پیدا ہوگا وعلیٰ ہذا القیاس۔ اس کا جواب حسب ذیل ہے:-

مراتب وصول کا بے شمار اور غیر منقطع ہونا اوسی صورت میں متصور ہے جبکہ
سالک کی سیر اسماء و صفات اور شیون و اعتبارات میں سیر تفصیلی ہو۔ ایسی
حالت میں بے شک اُس کی سیر کیلئے کوئی نہایت مقرر نہیں۔ اُسکا سفر (معنوی)
غیر منقطع ہے اور اس لئے اوس کا شوق بھی ممکن نہیں کہ زائل ہو لیکن ہمارا
موضوعِ بحث وہ خدا رسیدہ عارف کامل ہے جس نے ان تمام مراتب کو اجمالی
طور پر طے کرلیا ہو۔ اُس کا عروج غایۃ الغایات تک پہونچ چکا ہو اور وہ ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور اس کو لطیف و رنگین بنانا مقصود ہوتا ہے۔ اس کی
ایک مشہور مثال جو عموماً علم بدیع میں بیان کیجاتی ہے یہ شعر ہے ؎

ولا عیب فیھم غیر ان سیوفھم + بھن فلول من قراع الکتائب

شاعر اپنی قوم کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتا ہے "اور اون میں سوائے اسکے اور کوئی بھی عیب نہیں
کہ شیر صولت بہادروں کے ساتھ نوک جھونک کرنے کے باعث اُن کی تلواروں میں دندانے پڑگئے
ہیں"۔ ظاہر ہے کہ اس شعر میں اپنی قوم کی شجاعت کی نہایت تعریف کی ہے لیکن اسکا طرز ادا مذمت
کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اسیطرح حضرت صدیق اکبرؓ کا یہ فرمانا بھی بظاہر تو مذمت ہے لیکن امام صاحب اس
کی یہ تاویل فرماتے ہیں کہ سنگدلی سے مراد حصول وصل کی وجہ سے غیر متاثر ہونا ہے۔ عدم تاثر
کو سنگدلی سے تعبیر فرمایا اور اس لئے اونکے کلام میں المدح بما یشبہ الذم کی صفت پیدا ہوگئی۔

ایسے شگرف مقام پر فائز ہوا ہو جس کی تعبیر لفظوں یا اشاروں سے نہیں ہو سکتی تو وہاں توقع کا مفہوم کسی طرح بھی صادق نہیں آتا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شوق اور طلب (جو توقع کی فروع ہیں) کا وجود بھی متصور نہیں۔ یہ حال انہی بزرگواروں کو نصیب ہوتا ہے جو زمرۂ اولیائے کرام میں بھی مزید خصوصیت سے ممتاز ہیں۔ تنگنائے صفات سے اور آگے بڑھکر حضرت علیائے ذات تک واصل ہونا انہی بزرگواروں کا حصہ ہے۔ برخلاف اس کے جو سالک صفات اور شیونات کی سیر تفصیلی میں گرفتار ہیں وہ ہمیشہ کیلئے تجلیاتِ صفاتیہ کے نظارہ میں مشغول رہتے ہیں اور یہی ان کا منتہائے وصول ہے۔ حضرت والائے ذات تک عروج حاصل کرنا بجز اس کے متصور نہیں کہ صفات اور اعتبارات کو سیر اجمالی کے طور پر طے کرے لیکن جب سالک کو اسماء و صفات کی دشوار گذار گھاٹیاں سیر تفصیلی سے قطع کرنی پڑیں اس کے لئے تنگنائے صفات و اعتبارات سے گذرنا ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا شوق کبھی زائل نہیں ہوتا۔ وجد[1] اور تواجد کا وصف بھی برابر موجود رہتا ہے۔ شوق اور تواجد کا موجود ہونا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ سالک راہ ابھی تجلیات صفاتیہ سے محظوظ ہوا ہے۔ تجلی ذاتی سے مشرف نہیں ہوا۔ تجلی ذاتی سے بہرہ اندوز ہونے پر یہ ضروری ہے کہ شوق اور وجد کی صفت زائل ہو۔ ایک دوسرا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ وجود شوق کے لئے محبوب اور مراد کا نہ ملنا ضروری شرط ہے۔ باوجود محبوب و مراد کے میسر ہونے کے شوق متصور نہیں اور چونکہ

---

[1] قلبِ سالک میں حصول مطلب کے لئے ایک غیر معمولی حرارت کا پیدا ہونا۔ زیادہ تشریح مطلوب ہو تو احیاء علوم کی کتاب السماع ملاحظہ فرمائیں۔

خداوند پاک جل و علا کے حق میں کسی محبوب یا مراد کا نہ ملنا متصوّر نہیں اس لئے یہ توہم بھی بیجا ہے کہ اس کو کسی محبوب یا مراد کے متعلق شوق پیدا ہو حالانکہ حدیث قدسی مندرجہ عنوان میں خداوند پاک جلّ و علا کو صریحاً شوق سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شوق کا ذکر صنعت مشاکلہ[۱] کے طور پر واقعہ ہوا ہے۔ اشدّ کا لفظ بڑھانے کی توجیہہ یہ ہے کہ ہر ایک وصف کو جو خالقِ جبّار تعالےٰ شانہٗ وجلّ سلطانہ کی طرف منسوب ہو کسی ایسے لفظ کے ساتھ موصوف کرنا ضروری ہے جس سے ذاتِ باری جلّ و علا کی عظمت و جلال

---

[۱] یہ علم بدیع کی ایک اصطلاح ہے جسکی تعریف یہ ہے کہ کسی مفہوم کو ایک ایسے لفظ سے تعبیر کیا جائے جو درحقیقت اوس مفہوم کیلئے موضوع نہیں بلکہ اس کو ایک دوسرے لفظ کے ساتھ مطابق کرنا مطلوب ہو جو اس کے مقابل واقع ہوا ہے۔ اسکی توضیح ایک مثال سے بخوبی ہوسکتی ہے قرآن کریم میں ہے وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا (برائی کا بدلہ برائی ہی) یعنے جو شخص کسی دوسرے شخص پر ظلم اور دست درازی کرے تو مظلوم کو حق حاصل ہے کہ جائز طور پر اس کا انتقام لے۔ اس آیت کریمہ میں پہلا لفظ سیئۃ (برائی) تو اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہے لیکن دوسری جگہ سیئہ کے حقیقی معنے مراد نہیں ہوسکتے بلکہ اس پہلی برائی کا بدلا یعنی جائز طور پر اپنا حق لینا مراد ہے جس کو کسیطرح حقیقتاً برائی نہیں کہہ سکتے لیکن پہلے لفظ کی مناسبت سے اس مفہوم کو بھی اوسی لفظ سے تعبیر کیا گیا۔ اس کو صنعت مشاکلہ کہتے ہیں۔ امام صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اس حدیث قدسی میں بھی بندہ کی طرف تو شوق کی نسبت کرنا اپنے حقیقی معنوں کے لحاظ سے ہے لیکن خداوند پاک جل و علا کو شوق سے منسوب کرنا صرف مشاکلت اور مناسبت لفظِ اول پر مبنی ہے۔ اصلی معنے یہ ہیں کہ بندگان ابرار کا شوق جتنا بھی ہے میری نظر عنایت انکے حال پر اس سے بھی بڑھکر ہے لیکن شوق کے لفظ کے مقابلہ میں شوق ہی کا لفظ لانا انسب ہے۔

مترشح ہو۔ کیونکہ اُس کی ہر ایک وصف مخلوق کے اوصاف سے کہیں اعلیٰ اور برتر ہے۔ یہ جواب علمائے ظاہر کے مذاق کے مواقف بیان کیا گیا ہے۔ نیازمند کی رائے میں مشرب صوفیۂ کرام کے اصول کے بموجب دوسرے متعدد جوابات بیان کئے جا سکتے ہیں لیکن اُن جوابات کا صحو کی حالت میں ذکر کرنا غیر مستحسن معلوم ہوتا ہے۔ البتہ سکر کی حالت میں اون کو زبان پر لانا چنداں مضائقہ نہیں کیونکہ سکر کی حالت میں جو کچھ بھی کہدیا جائے وہ قابل مواخذہ نہیں ہوتا اور اس کا کہنے والا معذور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ارباب صحو کا معاملہ کچھ اور ہے اور وہ اپنے اقوال کے ہر ایک طرح سے جواب دہ ہیں۔ میں اب خالص صحو کی حالت میں ہوں اسلئے ارباب سکر کے مذاق پر کلام کرنا میرے شایان حال نہیں۔ والحمد للہ تعالیٰ اولاً و آخراً والصلوٰۃ والسلام علےٰ نبیہ دائماً و سرمداً +

"طریقہ عالیہ نقشبندیہ کی مدح سرائی۔ اس طریقہ کے علو نسبت کا بیان"

الحمد للہ وسلامٌ علےٰ عبادہ الذین اصطفےٰ۔ عنایت نامۂ والا جو آپ نے ازراہ اخلاص و کرم میرے نام ارسال فرمایا تھا وصول پایا۔ نہایت خوشی حاصل ہوئی۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی فضول بات سنا کر آپ کی سمع خراشی کروں بجز اس کے کہ طریقۂ علیہ نقشبندیہ کے

فضائل آپ کو سناؤں۔ جنابمن۔ اس سلسلۂ عالیہ کے اکابر طریقت قدس اللہ تعالےٰ اسرارہم کا قول ہے کہ "ہماری نسبت سب نسبتوں پر تفوق رکھتی ہے۔" نسبت سے مراد "حضور" اور "آگاہی" کا حاصل ہونا ہے۔ لیکن ان بزرگواروں کے نزدیک وہی حضور معتبر ہے جس میں غیبت واقع نہو۔ اس حالت کو وہ اپنی اصطلاح میں یادداشت کہتے ہیں۔ گویا نسبت اور یادداشت دو مترادف الفاظ ہیں۔ یادداشت کا جو مفہوم مَیں نے سمجھا ہے اوس کی تفصیل یہہ ہے:۔ تجلی ذاتی کا یہ مطلب ہے کہ حضرتِ ذات تعالےٰ و تقدس کا حضور ایسے طور پر حاصل ہو جس میں اسماء و صفات اور شیون و اعتبارات کچھ بھی ملحوظ نہوں۔ اس تجلی کو اکثر اہل عرفان تجلی برقی کہتے ہیں۔ اون کے نزدیک ایسی تجلی جس کے ساتھ شیون اور اعتبارات کے ملاحظہ کی کچھ بھی آمیزش نہ پائی جائے ایک لمحہ بھر کے لئے بہ مشکل میسّر ہوتی ہے۔ اس کے بعد ذات مقدس بدستور پردۂ شیون و اعتبارات میں محجوب رہتی ہے۔ اسلئے ایسے حضور کا متحقق ہونا جس کو حضورِ بے غیبت "کہتے ہیں ایک لمحہ سے زیادہ عرصہ کے لئے متصور نہیں۔ عارف کے اکثر اوقات غیبت کی حالت میں بسر ہوتے ہیں۔

اگرچہ دوسرے مختلف طریقوں کے مشائخ اس تجلی برقی کو سلوک و عرفان کے مراتب کا غایۃ الغایات تصور کرتے ہیں لیکن اکابر طریقۂ عالیہ نقشبندیہ اس نسبت (تجلی ذاتی برقی) کے حصول کو چنداں وقعت نہیں دیتے۔ ان کا مطمحِ نظر وہی حضور ہے جو دوامی ہو جس میں کبھی غیبت رونما نہو جب ذاتِ مقدس پردۂ اسماء و صفات اور شیون و اعتبارات سے بے نقاب ہو کر جلوہ گر ہو اور یہ حالت ہمیشہ کے لئے قائم رہے تو اس کو "حضورِ بے غیبت"

کہیں گے اور یہی حالت ان حضرات کا منتہائے طلب ہے۔ اب اس نسبت کا دوسرے طریقوں کی نسبت سے موازنہ کریں تو درمیان کا فرق خود بخود واضح ہو جائے۔ اس قسم کا حضور بے غیبت حاصل ہونا دوسرے اہل طرق کو بعید از وقوع معلوم ہوتا ہے لیکن اُنہوں نے کبھی اسپر غور نہیں کیا کہ

حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف

یہہ نسبت فی زمانا اس قدر عزیز الوجود ہو گئی ہے کہ اگر اسی طریقہ نقشبندیہ کے باخبر اصحاب سے بھی اس کا ذکر کیا جائے تو غالباً اکثر ارباب طریقت اس کے وجود ہی سے انکار کر دیں گے اور ایسی حالت کا رونما ہونا باور نہ فرمائینگے۔ طریقہ عالیہ نقشبندیہ کے مشائخ نے جو "نسبت" آجکل مشہور ہے (جس کو اُنہوں نے منتہائے کمال قرار دیا ہے) اوس کا مفہوم اونہوں نے یہہ سمجھ رکھا ہے۔ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کا حضور و شہود ایسے طور پر حاصل ہونا جو شاہد اور مشہود ہونے کے وصف سے مبرّا ہو اور ایک ایسی توجہ کا بظاہر دوام پذیر ہونا جس کا تعلق مشہور و معروف جہات ستہ سے نہو گو جہت فوقانی کا توہم زائل نہوا ہو۔ اسی حالت کو عام طور پر "نسبت" خیال کرتے ہیں۔ یہ نسبت فقط جذبہ کے مقام میں بھی حاصل ہو سکتی ہے اور دوسری نسبتوں پر اس کے تفوق رکھنے کی ظاہراً کوئی وجہ نہیں۔ لیکن اگر نسبت اور یادداشت کے وہی معنے لئے جائیں جو ہم نے بیان کئے ہیں تو اس میں کچھ شک نہیں کہ اوس کا حصول جذبہ اور سلوک کے تمام مقامات کو طے کر لینے پر منحصر ہے اور جس کا علوّ اور تفوق بھی اظہر من الشمس ہے۔ اگر کچھہ شک بھی ہے تو اس جلیل القدر حال کے حصول میں ہے مگر اس کے علوِّ شان میں کلام نہیں۔ اگر کوئی حاسد اپنے حسد کی وجہ سے انکار کرے یا ایک

ناقص اپنے قصورِ استعداد کے باعث محروم رہ کر اعتراف نہ کرے تو اس کو معذور سمجھنا چاہیئے ۔

قاصرے[1] گر کند ایں طائفہ را طعنِ قصور ٭ حاش للہ کہ برآرم بزباں ایں گلہ را
ہمہ شیرانِ جہاں بستۂ ایں سلسلہ اند ٭ روبہ از حیلہ چساں بگسلد ایں سلسلہ را

والسلام اولاً و اٰخراً

خواجۂ عمک کے نام لکھا گیا

"اپنے علوِ حال کا بیان ایک مبہم پیرایہ میں کیا گیا ہے"

آپکا عنایت نامہ والا پہونچا۔ نہایت خوشی حاصل ہوئی۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ مردانِ آزاد گرفتاروں کو فراموش نہ کریں یہ ایک عظیم سعادت ہے کہ واصلانِ راہ ہجرت زدگان کی غمخواری فرمائیں۔ مہجور بیچارے نے اپنے تئیں لائقِ دولتِ وصالِ محبوب نہ پاکر بحکم ضرورت کلبۂ احزان کے گوشۂ گمنامی میں رہنا پسند کیا۔ قرب سے فرار اور بُعد کو اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ اتصال پر انفصال کو ترجیح دی اور یہ معلوم کر کے کہ آزادی اختیار کرنے میں بھی گرفتاری سے رہائی ملنا محال ہے خوشی کے ساتھ مؤخر الذکر کو قبول کیا ۔

گر طمع[2] خواہد ز من سلطانِ دیں ٭ خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

---

[1] اگر کوئی کوتاہ فہم اس عالی ہمت گروہ کو قاصر بتائے تو بتائے لیکن میں تو معاذ اللہ زبان پر بھی یہ حرف نہ لاؤں۔ تمام جہان کے شیر صفت عارفانِ باکمال اسی سلسلہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لومڑی بیچاری اپنی کمزور حیلہ بازی سے اس مضبوط و مستحکم سلسلہ کو کیسے توڑ سکتی ہے ۔

[2] اگر دین کا بادشاہ (اللہ و رسول) چاہے کہ مجھ میں طمع کی صفت پیدا ہو جائے تو مجھے قناعت کی کیا پروا ہے۔ قناعت کے سر پہ خاک ۔

عبارت ہائے پریشان اور اشارات پراگندہ لکھ کر اس سے زیادہ آپ کی سمع خراشی کرنا نہیں چاہتا۔ خداوند پاک جل و علا ہم کو اور آپ کو سید الانبیاء محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی متابعت پر قائم اور ثابت قدم رکھے۔

نواں مکتوب (۲۹)

(شیخ نظام تھانیسری کے نام لکھا گیا)

۱۔ ادائے فرائض کی ترغیب ۔ سنن اور آداب کی رعایت ۔ نوافل کو فرائض کے مقابلہ میں ہیچ سمجھنا ۔ عشا کی نماز کو رات کے پچھلے نصف میں پڑھنے کی ممانعت ۔ آب مستعمل کو پینا ناجائز ہے ۔ پیر کو سجدہ کرنا حرام ہے ۔

خداوند پاک جل و علا ہم کو اور آپ کو بحرمت سید المرسلین صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم تعصب اور کج فہمی کی بلا سے محفوظ رکھے جن اعمال سے بارگاہ الٰہی تعالےٰ و تقدس میں انسان کو قرب حاصل ہوتا ہے دو طرح کے ہیں ۔ فرائض اور نوافل نوافل کو فرائض کے مقابلہ میں بالکل ہیچ اور بے حقیقت سمجھنا چاہیئے ۔ ایک وقت کا فرض الٰہی بجا لانا ہزار سال کی نفل عبادت سے یقیناً بہتر ہے گو ان نوافل کو کتنے ہی اخلاص کے ساتھ کیوں نہ ادا کیا جائے ۔ اس قاعدہ کو ہر قسم کی عبادات مثلاً نماز ۔ روزہ ۔ زکوٰۃ ۔ ذکر و فکر وغیرہ پر حاوی خیال کریں ۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ کسی فرض کو بجا لاتے وقت اس کے ضمن میں اس کی تکمیل کے لئے کسی سنت یا مستحب کا ادا کرنا بھی یہی حکم رکھتا ہے ۔ مؤطائے امام مالک میں (جو حدیث شریف کی ایک نہائت معتبر کتاب ہے) روایت ہے کہ حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے ایکدن صبح کی نماز

پڑھ کر حاضرین جماعت میں نظر دوڑائی تو اونہیں معلوم ہوا کہ سلیمان بن
ابی حشیمہ موجود نہیں۔ کسیقدر دن چڑھے ان کا گذر سلیمان مذکور کے مسکن
پر ہوا اور اونہوں نے سلیمان کی والدہ سے جو اُس وقت گھر میں موجود تھی
استفسار فرمایا کہ تمہارا بیٹا آج صبح کی جماعت میں کیوں شامل نہیں ہوا۔ اُنہنے
جواباً عرض کیا کہ چونکہ وہ رات بھر خدا کی عبادت میں جاگتا رہا اسلئے صبح کے
وقت اوس کی آنکھ لگ گئی اور وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے قاصر رہا۔
حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے فرمایا اس میں ذرہ بھی شک نہیں
کہ میرے نزدیک تو صبح کی نماز با جماعت ادا کرنا رات بھر کی شب بیداری سے
بہت بہتر ہے۔ اس سے ہم صاف طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ تکمیل فرائض کے لئے
کسی سنت یا مستحب کا بجا لانا اور اپنے فرض کو نقص سے محفوظ رکھنے کے لئے
مکروہ تحریمی[1] تو درکنار مکروہ تنزیہی سے اجتناب کرنا بھی ذکر و فکر اور مراقبہ
و توجہ سے ہزار درجہ افضل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ فرائض کو باین اہتمام بجا لانے
کے علاوہ کوئی شخص ذکر و فکر اور دیگر عبادات نوافل میں مشغول رہے اور اسمیں
بھی کچھ شک نہیں کہ دونوں (فرائض و نوافل) پر عمل پیرا ہونا غایت درجہ کی
فوز اور سعادت ہے۔ لیکن فرائض کو ناقص چھوڑ کر نوافل میں منہمک ہو جانا
کامیابی کی سبیل نہیں۔ مکرر میں کہتا ہوں کہ جس طرح فرض کی بجا آوری کو نوافل
کی بجا آوری پر بمراتب ترجیح حاصل ہے اسی طرح اوس فرض کے متعلق کسی

[1] جس امر کا ارتکاب صریح حرام نہو لیکن شرع میں اس سے پرہیز کرنا کم و بیش ضروری خیال
کیا گیا ہو اس کو مکروہ کہتے ہیں سخت مکروہ کو مکروہ تحریمی اور خفیف مکروہ کو مکروہ تنزیہی کہتے ہیں
مراقبہ اور توجہ علم تصوف کے خاص اشتغال ہیں۔ اگر ان کی حقیقت معلوم کرنا چاہیں تو شاہ ولی اللہ
صاحب کی کتاب "القول الجمیل" مطالعہ کریں۔

سنت یا مستحب کو بجا لانے کا بھی یہی حکم ہے۔ مثلاً جس طرح فرض زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے ایک پائی کا دینا نفل طور پر پہاڑوں کے پہاڑ زر سرخ خرچ کر دینے سے بمراتب بہتر ہے اسی طرح اگر اس مقدار زکوٰۃ کے ادا کرنے میں اس مستحب کا بھی خیال رکھا جائے کہ یہ پائی کسی رشتہ دار محتاج کو دی جائے تو یہ مستحب بھی علو درجہ کے لحاظ سے فرض ہی کی مانند ہے۔ اس قدر تمہید کے بعد آپ کو یہ بھی واضح طور پر معلوم ہو گیا ہو گا کہ عشا کی نماز کو اپنے وقت مستحب سے مؤخر کر کے رات کے پچھلے حصہ میں اس لئے ادا کرنا کہ نماز تہجد فوت نہ ہو جائے کس قدر قبیح اور موجب خرابی ہے۔ علماء حنفیہ کے نزدیک عشا کی نماز کو رات کے پچھلے نصف حصہ میں ادا کرنا مکروہ ہے۔ بظاہر اس سے کراہت تحریمی مراد ہے کیونکہ اونہوں نے تصریح کی ہے کہ نماز عشا کو آدھی رات تک ادا کرنا تو جائز اور مباح ہے لیکن نصف اخیر میں ادا کرنا مکروہ ہے۔ مکروہ کے لفظ کو مباح کے مقابلہ میں لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد مکروہ تحریمی ہے۔ علماء شافعیہ کے نزدیک تو اس وقت میں عشا کی نماز سرے سے جائز ہی نہیں۔ واسلئے محض تہجد بجا لانے کی خاطر اور اس وقت میں ذوق و حلاوت عبادت حاصل ہونے کی غرض سے ادائے فرض کے متعلق کراہت تحریمی کا ارتکاب کرنا نہایت ہی بُری بات ہے۔ اس غرض کے لئے نماز وتر کو مؤخر رکھنا کافی ہے بلکہ یہ تاخیر مستحب بھی ہے۔ اس طرح پر وتر کی نماز بھی اپنے مستحب وقت میں ادا ہونا متصور ہے اور نماز تہجد و سحر خیزی کی غرض بھی اچھی طرح پوری ہوتی ہے۔ الغرض اس عمل قبیح کو ترک کر کے اس طرح پڑھی ہوئی نمازوں کو قضا کرنا چاہیئے۔ امام اعظم کوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وضو کا ایک مستحب متروک ہو جانے کی وجہ سے چالیس سال کی پڑھی ہوئی نمازوں کا اعادہ کیا۔ جس پانی کو

ازالہ حدث کیلئے یا حصولِ قربت کی نیت سے ایکدفعہ وضو کرنے میں استعمال کیا گیا ہو اس کو کوئی شخص پینے کے لئے استعمال نہ کرے۔ آپ کو چاہئے کہ اس سے اجتناب کرائیں۔ کیونکہ حضرت امام اعظم کے نزدیک ایسا پانی نجاست غلیظہ کا حکم رکھتا ہے۔ فقہائے کرام نے آبِ مستعمل کا پینا ممنوع قرار دیا ہے اور اسے پینے کو مکروہ لکھا ہے۔ البتہ جو پانی وضو کرتے وقت وضو کے برتن میں

لہ اس مسئلہ کی تشریح یہ ہے کہ امام اعظم صاحب کے نزدیک جب پانی کو وضو یا غسل میں ایک دفعہ استعمال کیا گیا ہو اس سے دوسری دفعہ وضو یا غسل کرنا ناجائز ہے بلکہ امام صاحب کا یہ مذہب ہے کہ اس کا پینا بھی درست نہیں۔ ایسے پانی کو اصطلاحِ فقہ میں آبِ مستعمل کہتے ہیں۔ کسی پانی کو اس وقت آبِ مستعمل کہا جائیگا جبکہ اس کو ازالہ حدث یا حصول قربت کیلئے استعمال کیا گیا ہو۔ ازالہ حدث کے معنے بے وضو ہونے کی حالت کا دور کرنا۔ حصول قربت سے مراد محض ثواب حاصل کرنا ہے۔ اس کی توضیح ایک مثال سے ہو سکیگی۔ ایک شخص نے وضو کے اعضا کو بطور وضو کے دھو یا۔ سر کا بھی مسح کیا یعنے اس پر گیلا ہاتھ پھیر دیا لیکن اس کے دل میں وضو کرنے کی نیت نہیں تھی۔ صرف اعضا کو ٹھنڈک پہونچانے کیلئے اس نے ایسا کیا چونکہ امام صاحب کے نزدیک نیت شرط نہیں اسلئے اس کا حدث (بے وضو ہونے کی حالت) دور ہو گیا اور پانی ازالہ حدث کی وجہ سے آبِ مستعمل ٹھہرا جس کا حکم عنوان میں معلوم ہو چکا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک باوضو شخص محض ثواب حاصل کرنے کے لئے تازہ وضو کرتا ہے۔ اس صورت میں ازالہ حدث تو نہیں ہوا تاہم حصول قربت کی وجہ سے وہ آب مستعمل ہو گیا۔ لیکن اگر ایک باوضو شخص محض تفریح کے طور پر یا ٹھنڈک پہونچانے کی غرض سے وضو کے اعضا دھو لیتا اور سر پر گیلا ہاتھ پھیر لیتا ہے ایسی صورت میں نہ تو ازالہ حدث ہوا ہے اور نہ حصول قربت (حصول قربت اسلئے نہیں ہوا کہ ثواب حاصل کرنے کے لئے نیت شرط ہے) اسلئے یہ آب مستعمل نہیں کہا جائیگا اور ایسے پانی کو اگر دوبارہ بھی استعمال کریں یا پی لیں تو امام صاحب کے نزدیک جائز ہے۔

بچ رہتا ہے اسکا پانی شفائے امراض بیان کیا گیا ہے۔ اگر کوئی ارادتمند تبرکاً وضو
کا فضلہ استعمال کرنا چاہے تو مؤخر الذکر قسم کا پانی دیدیا کریں لیکن آب مستعمل
ہرگز نہ دیں۔ مجھکو بھی اب کی دفعہ دہلی میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ یارانِ
طریقت میں سے ایک صاحب کو بطور واقعہ[1] کے یہ دکھایا گیا کہ اگر میرے وضو
کا آبِ مستعمل استعمال نہیں کرینگے تو اونہیں سخت نقصان پہونچیگا۔ ہر چند مینے
ٹالنا چاہا لیکن اونہوں نے نہ مانا۔ فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ کی تحقیق کیگئی تو معلوم
ہوا کہ کسی عضو کو تین مرتبہ دھوکر چوتھی دفعہ اس طرح پر دھوئے کہ حصول قربت
کی نیت نکرے تو یہ پانی آبِ مستعمل نہیں کہلائیگا اور اسلئے وہ نجس بھی نہیں ہوگا۔
اس ترکیب کو عمل میں لاکر اس کا اصرار پورا کیا۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپکے بعض خلفائے طریقت کو لوگ سجدہ کرتے
ہیں اور زمین بوسی کو بھی تعظیم پیر کیلئے کافی نہیں خیال کرتے۔ یہ ایک ایسا فعل ہے
جس کی قباحت اظہر من الشمس ہے۔ آپکو مناسب ہے کہ اسکا نہایت سختی کے ساتھ
انسداد کریں۔ اس قسم کے اعمال شنیعہ سے ہر ایک مسلمان کو اجتناب کرنا فرض ہے
لیکن جس شخص کے افعال و اعمال کا اور لوگ بھی اقتدا کریں اُسکے حق میں ایسی غیر مشروع
اور ناجائز حرکات کا ارتکاب کرنا یا کرنے دینا اور بھی سخت مذموم ہے۔ اس لئے
ایسی باتوں سے پرہیز رکھنا اُسکے لئے نہایت اشد ضروری ہے۔ عام لوگ اُس کو
دیکھکر اس کا اقتدا کرتے اور چاہ ضلالت میں گرتے ہیں۔ یہ بھی آپ سمجھ لیں کہ صوفیہ
کرام کا سرمایۂ علوم احوال[2] محمودہ کے حصول تک محدود ہے لیکن احوال محمودہ کا پیدا

---

[1] جو کیفیت خواب میں دکھائی دے یا بطریق مکاشفہ کے کسی بات کا انکشاف ہو اس کو اہل تصوف کی اصطلاح میں واقعہ کہتے ہیں۔

[2] یہاں حال و قال کا فرق جو کسی گذشتہ مکتوب کے ذیل میں واضح کر دیا گیا تھا ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ احوال جمع حال کی ہے۔

ہونا اعمال حسنہ بجا لانے کا نتیجہ ہے۔ جبتک کوئی شخص اپنے اعمال کی اصلاح نہ کرے وہ علوم معرفت کے احوال عالیہ سے ہرگز بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ یہہ بھی ظاہر ہے کہ اعمال کی اصلاح و تصحیح تب ہی ممکن ہے کہ ہر ایک عمل صالح کی کیفیت اور حقیقت سے علم اور آگاہی حاصل کیجائے۔ مطلب یہہ ہے کہ سب سے مقدم طور پر احکام شرعیہ کا علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ عبادات مثلاً نماز۔ روزہ اور دیگر فرائض اسلام۔ مختلف معاملات مثلاً نکاح۔ طلاق۔ خرید و فروخت الغرض ہر ایک ایسی چیز جس کا بجا لانا خدا کی جانب سے واجب کیا گیا ہے اور جس بات کی انبیائے عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دعوت دی ہے ان سب کا علم حاصل کرنا تصوف و عرفان کا پہلا مرحلہ ہے۔ یہ علم (علم احکام شرعیہ) ایک امر اکتسابی ہے جس کا حصول انسان کی اپنی جد و جہد اور سعی و کوشش پر منحصر ہے۔ علم کے لئے دو طرح کی کوشش کرنی پڑتی ہے (۱) حصولِ علم سے پہلے اُس کے حاصل کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں (۲) علم کو حاصل کرکے اُسکے بموجب اپنے اعمال و اخلاق کو درست کرنے کیلئے جد و جہد کرنا ضروری ہے۔ اس تمہید کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آپکی مجلس والا میں کتب تصوف کا درس اور مذاکرہ ہوا کرتا ہے اسی طرح علم فقہ کی کتابوں کا پڑھانا بھی لازم ہے۔ فارسی زبان میں فقہ کی کتابیں کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً مجموعۂ خانی۔ عمدۃ الاسلام۔ اور کنز فارسی وغیرہ۔ بلکہ علم احکام شرعیہ کا حاصل کرنا اس قدر اہم ہے کہ اگر کتب تصوف کا درس متروک بھی ہو جایا کرے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن کتب شرعیہ کا مطالعہ اور درس موقوف نہو۔ اول الذکر کا تعلق صرف احوال باطن سے ہے جنکا حاصل کرنا فرض مؤکد نہیں بلکہ فقط تکمیلِ نفس کا ذریعہ ہے لیکن مؤخر الذکر کا تعلق اعمال سے ہے جن پر نجات آخرت کا دارومدار ہے۔ زیادہ لکھنا فضول ہے القلیل یدل علی الکثیر۔

(مشتے نمونہ خروارے و اند کے دلیل بسیارے) ؎

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم ٭ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

خداوند پاک جلّ و علا ہم کو اور آپ کو حبیب خدا آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی کامل متابعت نصیب فرمائے

دسواں مکتوب (۱۰)

(ملا محمد صدیق جو امام صاحب کے پرانے پیش خدمت ہیں ان کا قول ہے کہ یہ مکتوب بھی شیخ نظام تھانیسری کے نام لکھا گیا ہے)

شہود آفاقی اور شہود انفسی کا بیان۔ شہود انفسی اور تجلی صوری کا فرق۔ مقام عبدیت ایک نہایت اعلیٰ مقام ہے۔ اس مقام کے علوم و معارف علوم شرعیہ کے عین مطابق ہوتے ہیں وغیرہ۔

خداوند پاک جلّ و علا آپ کو آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی کامل متابعت سے مشرف اندوز کر کے سنّت نبویہ کے زیور عالی گوہر سے آراستہ فرمائے میں نہیں سمجھتا کہ میں کیا لکھوں۔ اگر سوائے پاک تعالےٰ و تقدس کی بارگاہ قدس کے کے متعلق کچھ خامہ فرسائی کروں تو میرا یہ کہنا محض جھوٹ اور بہتان ہوگا۔ اس کی جناب کبریاء اس سے بالاتر ہے کہ مجھ جیسے یاوہ گو کے زبان زد ہو مخلوق کو کیا مجال کہ خالق بیچوں کی ذات و صفات مقدسہ کا بیان کرے۔ محدث[1] (حادث) اور قدیم کی آپس میں کیا مناسبت ؟ مکانی کو لامکانی کی حقیقت

[1] جو چیز عدم سے موجود ہوئی ہے یعنے پہلے نیست تھی پھر ہست ہو گئی اس کو محدث کہتے ہیں۔ اس کے بالمقابل جو چیز ازلی ہے اس کو قدیم کہیں گے جیسے ذات و صفات الٰہی جن پر

دریافت کرنے کا کیا مقدور اور کیا حوصلہ؟ عاجز مخلوق کو اپنی ذات سے باہر
کی اشیاء پر دسترس نہیں۔ اس کی دوڑ اور تیز روی اپنے تک محدود ہے۔ کسی
عارف نے اسی مضمون کو کیسا اچھا ادا کیا ہے ؎

ذرہ گر بس نیک ور بس بد بود + گرچہ عمرے تگ زند در خود بود

(ذرۂ ناچیز خواہ وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو یا کتنا ہی برا کیوں نہ ہو بہر کیف اگر وہ
عمر بھر بھی تگ و دو میں مصروف رہے اس کی سیر اپنی ذات تک محدود ہو گی) یہہ
زیدِ قصور بھی سیر انفسی میں حاصل ہوتی ہے جو منتہائے سلوک ہے حضرت
خواجۂ نقشبند قدس اللہ تعالے سرہ کا قول ہے کہ "اولیاء اللہ فنا اور بقا کا
مرتبہ حاصل کر لینے کے بعد جو کچھ بھی مشاہدہ کرتے ہیں اپنی ذات میں مشاہدہ کرتے
ہیں اور جو کچھ بھی انہیں معرفت حاصل ہوتی ہے اپنی ذات میں حاصل ہوتی ہے۔
اُن کی حیرت اپنے وجود میں ہے" وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ" (سب کچھ تمہاری
اپنی ذات میں ہے۔ کیا تم چشم بینا نہیں رکھتے؟) اس سے پہلے جس قدر بھی سیر واقع
ہو وہ سیر آفاقی کے حدود کے اندر ہے جس سے کوئی معتد بہ منفعت حاصل نہیں ہوتی۔
اس کا بے منفعت ہونا اصل مطلب تک پہونچنے کے لحاظ سے ہے ورنہ سیر آفاقی
بھی آلاتِ مطلوب اور شرائط راہ عرفان سے ہے۔ حضرت شاہ نقشبند قدس
اللہ سرہ نے جس "شہود[1] انفسی" کا بیان فرمایا ہے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کرنے کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کوئی بھی ایسا زمانہ نہیں گذرا کہ وہ معدوم ہوں۔ سوائے ذات و صفات
الٰہی سب اشیاء محدث ہیں۔ لامکانی سے مراد ذات پاک الٰہی جل وعلا ہے جو مکان کے تعلق سے برتر ہے۔

---

[1] شہود انفسی سے ایک خاص تجلی ذاتِ حق کی مراد ہے۔ تجلی کے مفہوم کے متعلق ایک ذیلی حاشیہ
میں کسیقدر تشریح کر دیگئی ہے جس کو یہاں بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ تجلی صوری کی تشریح خود امام
صاحب نے مختلف مکتوبات میں فرمائی ہے۔ متجلّی لہٗ وہ شخص ہے جس کو تجلّی حاصل ہو۔

احتراز کرنا چاہیئے یہ تو ہم نہ کر بیٹھیں کہ وہ شہود بھی تجلی صوری کے مشابہ ہوگا جس کا ظہور شخص متجلّٰی لہٗ کے اپنے نفس میں ہوتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں تجلی صوری جس قسم کی بھی ہو سیر آفاقی میں داخل ہے۔ اس وقت ابھی علم الیقین کا مرحلہ طے نہیں کیا ہوتا لیکن شہود انفسی اُس وقت میسّر ہوتا ہے جبکہ حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہو جو مراتب کمال کا انتہائی مرحلہ ہے۔ شہود کا لفظ بولنا بھی لغت اور عبارت کی تنگئ میدان کی وجہ سے ہے (اس خاص کیفیت سے تعبیر کرنے کیلئے کوئی ایسا لفظ لغت میں ہے ہی نہیں جو اس کی کُنہِ حقیقت کو ظاہر کرسکے) اسلئے مجبوراً یہی لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے ورنہ جس طرح ان عالی ہمت مردانِ راہ کا مطلوب بے چون و بے چگون ہے اسی طرح وہ نسبت جو اون کو اپنے مطلوب سے حاصل ہوتی ہے (جو منتہائے عرفان ہے) وہ بھی بے چون و بے چگوں ہے اور عبارت اس کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ حضرت مولوی معنوی مولانا روم علیہ الرحمۃ نے

لے کسی چیز کے وجود کا یقین تین طرح پر حاصل ہو سکتا ہے (۱) استدلال سے (۲) معائنہ سے (۳) تجربہ سے اسکی توضیح ایک مثال سے ہو سکتی ہے۔ فرض کیجئے ہم نے دور سے دھواں دیکھا۔ دہواں اور آگ لازم و ملزوم ہیں اسلئے اول الذکر کی وجہ سے ہم استدلال کر سکتے ہیں کہ مؤخر الذکر بھی ضرور موجود ہے یعنی دہواں دیکھکر ہم یقین کرینگے کہ جہاں سے دہواں نکل رہا ہے وہاں آگ موجود ہے۔ یہ استدلال ہے اور اسطرح جو یقین حاصل ہو اس کو علم الیقین کہتے ہیں۔ دوسرا درجہ معائنہ کا ہے چنانچہ ہم وہاں جاکر آگ کے شعلے بچشم خود مشاہدہ کرلیں اس کو عین الیقین کہینگے۔ مزید برایں جب ہم اس آگ میں ہاتھ ڈالکر اپنے پر اس کی خاصیتِ احراق کا تجربہ بھی کرلیں تو اس مرتبہ یقین کا نام حق الیقین ہے۔ امام صاحب نے بھی ایک مکتوب میں یقین کے انہیں مراتب سہ گانہ کی تشریح فرمائی ہے جو اس سے کسی قدر مختلف ہے لیکن عام طور پر یہی تفصیل اور تعریف درست سمجھی جاتی ہے اور خود امام صاحب نے جو تشریح فرمائی ہے اس کا سمجھنا بھی اسی پر موقوف و منحصر ہے۔

کیا خوب فرمایا ہے ؎

اتصالے[1] بے تکیف بے قیاس ٭ ہست رب الناس را با جان ناس

لیک گفتم ناس را نسناس نہ ٭ ناس غیر از جان جاں اشناس نہ

مذکورہ بالا توہم پیدا ہونے کی وجہ یہہ ہے کہ دونوں صورتوں میں بقائے شخص[2] موجود ہے اور اسی وجہ سے شہود انفسی اور شہود صوری (جو تجلی صوری میں حاصل ہوتا ہے) آپس میں مشابہ مگر معلوم ہوتے ہیں۔ بقائے شخص کا باعث یہ ہے کہ تجلی صوری موجبِ فنائے شخص نہیں اور گو وہ کسی نہ کسی طرح قیود کو رفع کر دیتی ہے لیکن پھر بھی فنا حاصل نہیں ہوتی اور اسلئے تجلی صوری کے حصول کی حالت میں بھی سالک کے وجود کا بقیہ موجود رہتا ہے۔ سیر انفسی تو محلِ اشتباہ ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اس کا حصول تب ہی متصور ہے جبکہ فنائے تام اور بقائے کامل حاصل ہو چکی ہو۔ چونکہ ان دونوں بقاؤں میں فرق نہایت دقیق ہے اس لئے بظاہر دونوں حالتیں متحد معلوم ہوتی ہیں۔ اگر یہ عام طور پر معلوم ہو جائے کہ اہل عرفان کے نزدیک بقائے ثانی سے مراد یہہ ہے کہ بقاء باللہ حاصل ہو جس کو وہ "وجود موہوب حقانی" کہتے ہیں تو ممکن ہے کہ یہہ توہم واقع نہو۔ بقا باللہ کے یہ معنے سمجھنا غلط ہے کہ اپنی ذات اس کو عین ذات حق تعالےٰ و تقدس دکھائی دی

---

[1] ترجمہ: ذات پاک خالق جلّ وعلا کو اپنی مخلوق سے ایک ایسا خاص تعلق اور اتصال ہے جسکی نہ تو کیفیت بیان کی جا سکتی ہے اور نہ وہ تعلق و اتصال سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن مخلوق سے میری مراد انسان کامل ہے۔ وہ نہیں جو بن مانس کی طرح فقط صورتِ انسان ہو۔ انسان حقیقی وہی ہے جس کو محبوب حقیقی (حق جلّ وعلا) کی معرفت حاصل ہو۔

[2] بقائے شخص سے مراد عدم فنا ہے۔ آگے کی عبارت پڑھنے سے یہ مطلب خود بخود کھل جاتا ہے۔ فنا و بقا سے وہی تصوف اور طریقت کی اصطلاحی فنا و بقا مقصود ہے۔

اگر صوفیۂ کرام کے بعض عبارتوں سے اس قسم کے معنی مفہوم بھی ہوں تو اس کا جواب یہی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس مفہوم کے لحاظ سے بعض سالکان طریقت کو جذبہ کے مقام میں استہلاک اور اضمحلال (جو فنائے تام سے مشابہ ہے) کے بعد بقا حاصل ہوتی ہے۔ اس کو اکابر نقشبندیہ اپنی اصطلاح میں وجود عدم کہتے ہیں۔ یہ حالت فنائے حقیقی سے پہلے حاصل ہوتی ہے اور زوال پذیر ہے۔ کبھی رونما ہوتی ہے اور کبھی معدوم ہو جاتی ہے لیکن جو بقا فنائے حقیقی (فنائے تام) کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ زوال اور خلل سے بالکل محفوظ ہے۔ اکابر نقشبندیہ کی فنا بھی دائمی ہے چنانچہ یہ کہنا بالکل درست و بجا ہے کہ ایسا مرد کامل عین بقا میں فانی اور عین فنا میں باقی رہتا ہے جس فنا و بقا کو دوام نہیں وہ تو احوال[1] اور تلونیات کے قبیلہ سے ہیں جس سے ہمیں کچھ بھی سروکار نہیں۔ حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالیٰ سرہ کا قول مبارک ہے "وجود عدم[2] بوجود بشریت عود میکند اما وجود فنا بہ وجود بشریت عود نمیکند" اس تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرات نقشبندیہ کے نزدیک وقت[3] اور حال وہی معتبر ہے جو دائمی ہو بلکہ اُن کی نسبت عالیہ میں وقت اور حال کے مفہوم کو بھی دخل نہیں۔ انکا

---

[1] احوال و تلوینات سے مراد ایک غیر پائدار حالت کا نمودار ہونا ہے۔

[2] ترجمہ "وجود عدم" (جس سے مراد وہی استہلاک اور اضمحلال کی حالت ہے جو مرتبۂ فنا کی حاصل ہونے سے پیشتر حاصل ہوتی ہے جسکا ذکر چند سطر پہلے امام صاحب فرما چکے ہیں) وجود بشریت کیطرف عود کر آتا ہے لیکن فنا کا مرتبہ حاصل ہو تو وجود بشریت کا عود نہیں کرتا" امام صاحب کا مطلب اس عبارت کے نقل کرنے سے یہ ثابت کرنا ہے کہ "وجود عدم" کی حالت اگرچہ مقام فنا کے مشابہ ہے لیکن اسکو دوام و استقرار نہیں اور جس حالت یا مقام کو دوام و استقرار نہیں وہ اکابر نقشبندیہ کے نزدیک کچھ بھی قابل اعتبار نہیں۔

[3] اس موقعہ پر "وقت" کا لفظ بھی اصطلاحی طور پر "حال" کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

معاملہ اُس ذاتِ متعالیہ سے ہے جو خالقِ اوقات اور مکوّن و مقلّب احوال ہے زوال پذیر ہونا مخلوق کی خاصیت ہے اور اسلئے یہ خاصیت وقت اور حال میں تو پائی جاتی ہے لیکن جس شخص کا معاملہ اس مرحلہ سے گذر کر خالق اوقات واحوال تک جا پہونچا ہے اُس کو تغیر اور زوال کا خوف نہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عنایت کرتا ہے اور خدا تو بڑے فضل والا ہے) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جو اکابر طریقت نے فرمایا ہے کہ "وجود فنا بہ وجود بشریت عود نمیکند" جس کا ماحصل یہ ہے کہ نقطۂ کمال پر پہونچکر جو وقت اور حال حاصل ہوتا ہے وہ دائمی ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ اوس "وقت" کا اثر از قسم "تعین"[1] وغیرہ باقی رہتا ہے یہ نہیں کہ عین "وقت" کو دوام اور بقا حاصل ہے۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ عین "وقت" اور نفسِ "حال" کو دوام واستمرار حاصل ہے۔ جو کچھ ان لوگوں نے کہا ہے بغیر کسی دلیل کے محض اٹکل پچو کہدیا ہے وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (یہ قرآن کریم کی آیت ہے جس کے معنے یہی ہیں کہ اٹکل پچو باتیں (بغیر کسی قسم کے ثبوت صحیح کے) کسی امر کو حق بجانب ٹھہرانے کیلئے کچھ بھی مفید نہیں) بلکہ میں کہتا ہوں کہ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (یہ بھی قرآن کریم کی آیت ہے۔ یعنے ضرور بعض اٹکل پچو باتیں خلاف شرع دگناہ) ہوتی ہیں) بات بڑھتی بڑھتی کہیں سے کہیں جا نکلی ہے۔ اس طولانی تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ حق تعالےٰ وتقدس کی جناب کبریا اس سے برتر ہے کہ توسنِ قلم کو اس کے میدان قدس میں جولانی کرنے کی جرأت ہو سکے اس لئے

---

[1] تعین کا مفہوم اہل تصوف کی اصطلاح میں کچھ ایسا دقیق ہے کہ ہم اسکی تشریح واضح طور پر نہیں کرسکتے امام صاحب کے مکتوبات میں جستہ جستہ اس کی تحقیق ملتی ہے اور زیادہ تفصیل معلوم کرنا چاہیں تو ابن عربی کی فتوحات مکیہ (جو ایک نادر اور ضخیم کتاب عربی زبان میں ہے) مطالعہ فرمائیں۔

ہمیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بندگی، ناچیزی اور مذلت کو مدنظر رکھکر آپکو
چند ایک باتیں سنائیں :-

نوعِ انسان کی آفرینش کا اصل مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے خالق تعالےٰ و تقدس
کی عظمت اور جلال کو معلوم کر کے اپنی عزیز زندگی کو لوازم بندگی اور وظائف
عبودیت میں صرف کرے۔ عشق و محبت الٰہی کو راہ سلوک و عرفان کا جزو اعظم
بلکہ مطلوب اعظم خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ بھی مقصود بالذات نہیں بلکہ مقام عبودیت
کے حصول کا ایک وسیلہ ہے۔ سلوکِ راہ معرفت کی ابتدا اور وسط میں اس کا
وجود اسلئے ضروری ہوتا ہے کہ سالک کا تعلق قلبی تمام غیر اللہ سے قطع ہو کر
صرف محبوبِ حقیقی اُس کا قبلۂ توجہ قرار پائے۔ خالق جلّ و علا کی خالص عبودیت
تب ہی حاصل ہوتی ہے کہ غیر اللہ کی گرفتاری اور عبدیت سے بالکل آزاد ہو جائے
عشق و محبت اسی انقطاعِ تعلق کا ایک ذریعہ ہے۔ مراتبِ ولایت کا آخری
مقام عبدیت ہی جس سے بڑھکر کوئی جلیل القدر رُتبہ کمالات انسانی میں نہیں۔
اس مقام پر پہونچکر بندہ اپنے تئیں مولائے پاک جلّ و علا سے محض بے مناسبت
سمجھنے لگتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مخلوق از خاک اور جناب کبریائی خالقِ پاک کے
درمیان کچھ بھی مناسبت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ مناسبت یہی ہے کہ بندہ
ہر ایک طرح سے اپنے مولائے پاک جلّ و علا کا محتاج ہے اور حق تعالےٰ و تقدس
اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے کسی کا کچھ بھی محتاج نہیں۔ (اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ
الْعَالَمِیْنَ[1]) وہ یقین سمجھتا ہے کہ میری ذات حقیرہ کو حق تعالےٰ و تقدس کی ذات
متعالیہ سے میری صفات ناقصہ کو خالق پاک جلّ و علا کی صفات مقدسہ سے
اور میرے افعال پر از عیب و نقصان کو ایزد متعال کے افعالِ بے زوال

---

[1] ضرور خدائے پاک جلّ و علا تمام مخلوق سے بے نیاز ہے۔

برتراز وہم وخیال سے کچھ بھی مناسبت نہیں۔ وہ یہہ کہنے سے بھی سخت اجتناب کرتا ہے کہ بندہ کی ذات یا اس کے افعال وصفات حضرت حق تعالے وتقدس کی صفات وافعال کا پرتو اور عکوس[1] وظلال ہیں۔ کیونکہ ظل یا پرتو کا اطلاق کرنے سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ خالق ومخلوق میں کچھ تو مناسبت ہے۔ ایک عارف کامل اس سے زیادہ کہنے کی ہرگز جرأت نہیں کرسکتا کہ بندہ مخلوق ہے اور حق تعالے وتقدس اُسکا خالق جس لفظ میں ذرہ بھی مناسبت کا ایہام پایا جائے وہ اُسکا زبان پر لانا گستاخی سمجھتا ہے۔ بعض سالکان راہ کو قطع مراحل ومنازل کی اثنا میں توحید فعلی کا مقام حاصل ہوتا ہے جس میں وہ تمام دنیا ومافیہا کے افعال کو صادر عن اللہ سمجھتے ہیں اور سوائے حق تعالے وتقدس کے اونہیں کوئی بھی دوسرا فاعل نظر نہیں آتا لیکن باایں ہمہ اکابر طریقت جانتے ہیں کہ اس توحید کی حقیقت یہہ ہے کہ ان سب افعال کا خالق ایک ہے یعنی اللہ تعالیٰ وتقدس۔ یہہ نہیں کہ حق تعالے وتقدس بلاواسطہ ہر ایک فعل کا فاعل بھی ہے۔ ایسے اعتقاد کو تو الحاد یا زندقہ کہنا کچھ بھی نامناسب نہیں۔ اس حقیقت کی مزید توضیح کیلئے ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شعبدہ باز پردہ میں بیٹھکر چند ایک بیجان تصویروں کو حرکت میں لاتا ہے اور اون بیجان تصویروں سے نہایت عجیب وغریب رقاصانہ حرکات ظہور میں آتی ہیں۔ حاضرین میں سے جو لوگ تیز بصر ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان بیجان صورتوں کو حرکت میں لانیوالا کون ہے؟ کیونکہ اون میں بذات خود حرکت کرنے کی کچھ بھی استعداد نہیں۔ اُن کی حرکات کا موجد وہی شعبدہ باز پردہ نشین ہے لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان حرکات کی بلاواسطہ نسبت خود انہی صورتوں کی طرف ہوسکتی ہے۔ ظاہراً

[1] عکوس عکس کی جمع ہے اور ظلال جمع ظل بہ معنٰے سایہ کے ہے۔

یہی کہیں گے کہ صورتیں حرکت کر رہی ہیں۔ یہ کہنا خود غلط اور خلاف واقع ہے کہ شعبدہ باز حرکت یا رقص کر رہا ہے۔ الغرض توحید فعلی کی جو حقیقت بیان کیگئی ہے وہ بالکل صحیح و درست ہے اور تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صریحًا یہی تعلیم ہے۔ توحید فعلی کی یہ حقیقت سمجھنا کہ جو افعال ظاہرًا مخلوق سے سرزد ہوتے ہیں اون کا فاعل بھی حق تعالےٰ و تقدس ہے منجملہ سکریات طریقت کے ہے۔ حق بات یہ ہے کہ فاعل کے متعدد ہونے میں ذرہ بھی شک نہیں۔ ہاں ان سب افعال کا خالق ایک ہی ہے۔ توحید[1] وجودی کے متعلق بھی جو کچھ سالکان طریقت سے منقول ہے وہ سکر اور غلبۂ حال کی وجہ سے ہے۔ علوم باطن کی حقانیت کا معیار یہ ہے کہ وہ شریعت

[1] توحید فعلی کی تشریح تو خود امام صاحب نے متن مکتوب میں کردی ہے اور محققانہ اور عامیانہ معنوں میں فرق بھی بتا دیا ہے۔ توحید وجودی کی تشریح یہ ہے کہ بعض اہل تصوف کے نزدیک سوائے ذات پاک خدا جل و علا کے اور کوئی بھی چیز موجود نہیں۔ وہ ذات حق کو "وجود ساری" (یعنے وہ وجود جو تمام عالم میں سرایت کئے ہوئے ہے) مانتے ہیں۔ خالق اور مخلوق کو دریا اور موج سے تشبیہ دیتے ہیں وعلےٰ ہذا القیاس۔ اس جماعت کے امام ابن عربی ہیں اور اہل تصوف کے اس گروہ کو ارباب توحید وجودی کہتے ہیں۔ لیکن امام صاحب اس کے قائل نہیں۔ بایں ہمہ ارباب توحید وجودی پر بھی طعن نہیں کرتے بلکہ ان کے اس اعتقاد کو سکر اور غلبۂ حال پر محمول کرتے ہیں۔ غلبۂ حال سے مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک عاشق منہمک کو سوائے محبوب کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی حالانکہ خارج میں بے شمار اشیاء موجود ہوتی ہیں اسی طرح ان لوگوں کو بھی سوائے ذات پاک جل و علا کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ خود امام صاحب توحید وجودی کے وہی معنے لیتے ہیں جس کی تشریح انہوں نے توحید فعلی میں فرمائی ہے یعنی اگرچہ دوسری چیزیں بھی خارج میں متحقق اور موجود ہیں لیکن خدائے پاک جل وجلالہ و علا کے وجود کے مقابلہ میں دیگر تمام اشیا کا وجود ہیچ ہے۔ ان سب کا وجود اسی ذات متعالیہ کا عطیہ ہے اور ان کا قیام و ثبات بھی اسی کے فیضان پر موقوف ہے

مقدسہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے عین مطابق ہوں۔ بال بھر کا تفاوت
بھی نظر نہ آئے تو سمجھ لیجئے کہ سکر کا نتیجہ ہے۔ جو کچھ اہل سنت والجماعت کے علماء محققین
نے دلائل شرعیہ سے تحقیق کر کے بیان فرمایا ہے اُنہی مسائل کو حق صریح اور
اعتقاد صحیح سمجھنا چاہیئے اور جو ذرہ بھر بھی اسکے خلاف ہو تو وہ دو حالتوں سے
خالی نہیں یا تو وہ الحاد اور زندقہ ہے یا بصورت دیگر سکر اور غلبہ حال کا نتیجہ ہے۔
علوم باطن اور حقائق شرعیہ کی صحیح تطبیق اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب
سالک کو مقام عبدیت حاصل ہو لیکن اس سے پہلے سُکر کلیۃً زائل نہیں ہوتا اور
ہر ایک مقام میں اس کا کچھ نہ کچھ شائبہ پایا جاتا ہے۔ یہ بیان بہت طویل ہے ؎
"گر بگویم شرح ایں بے حد شود" ایک شخص نے حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ
تعالےٰ سرہٗ کی خدمت میں عرض کیا کہ سلوکِ طریقت سے کونسا مقصود حاصل ہوتا
ہے جس کے لئے اس قدر جدوجہد کی ضرورت ہے، اونہوں نے ارشاد فرمایا: "سلوک
طریقت سے یہہ مقصود ہے کہ معرفت اجمالی تفصیلی ہو جائے اور استدلال کشف
سے مبدل ہو" یہ نہیں فرمایا کہ شریعت مقدسہ نے جو معارف و حقائق بیان
فرمائے ہیں اُن کے علاوہ اور معارف و حقائق حاصل ہوں۔ گو اثنائے راہ سلوک
میں کچھ زائد امور بھی منکشف ہوتے ہیں لیکن اگر سالک کو انتہائی مرحلہ تک پہونچنا
نصیب ہو تو وہ سب زوائد کافور ہو کر وہی معارفِ شرعیہ قائم اور ثابت رہتے
ہیں۔ البتہ انہیں معارف کا انکشاف تفصیلی طور پر ظہور میں آتا ہے اور وہی
حقائق جو پہلے از روئے استدلال معلوم ہوئے تھے کشف کے ذریعہ معلوم ہو جاتے
ہیں (جس سے بردِ قلب اور اطمینان دل کی اعلےٰ حالت حاصل ہوتی ہی) جس طرح آنحضرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مسئلہ توحید وجودی تصوف کا معرکۃ الآراء مسئلہ ہے اور امام صاحب
نے مختلف مکتوبوں میں نہایت بسط کے ساتھ اسپر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ مکتوب اس مکتوب کے بعد شروع
ہوتا ہے اس میں بھی اس کا کسیقدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

صلے اللہ علیہ وسلم نے ان علوم کو وحی کے ذریعہ مبدءِ فیاض سے اخذ کیا تھا اسی طرح یہ کاملانِ طریقت الہام صحیح اور کشف صریح کے ذریعہ انہی علوم و معارف کو اسی ماخذ اصلی سے حاصل کرتے ہیں۔ لیکن علمائے کرام نے انہی علوم کو اجمالی طور پر دلائل شرعیہ کے ذریعہ استدلال کے طور پر حاصل کیا ہے جس طرح یہ علوم و معارف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو تفصیلی طور پر بطریقہ کشف (بغیر کسی قسم کے استدلال کے) حاصل ہوتے ہیں بزرگوارانِ طریقت کی بھی بعینہٖ ویسی ہی حالت ہے۔ اصالت اور تبعیت کا فرق ہے۔ (انبیاء اصل ہیں اور اولیاء اللہ کو اُن کی کامل متابعت ہی کی بدولت یہ سعادت نصیب ہوتی ہے) لیکن یاد رہے کہ اس قسم کے کامل اولیا مدتہائے دراز کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور یہ سعادت نہایت کمیاب وعزیز الوجود ہے۔ میرا خیال تھا کہ بطور تمثیل ایک اجمالی معرفت کو تفصیلی طرز پر لکھوں لیکن قلم نے کوتاہی کی۔ شائد خداوند پاک جل وعلا کی اس میں بھی کوئی حکمت غامضہ پوشیدہ ہوگی۔ والسلام۔

گیارھواں مکتوب (۳۱)

(شیخ صوفی کے نام لکھا گیا)

توحید وجودی کی حقیقت۔ حق تعالےٰ وتقدس کے قرب اور معیّت ذاتی کا بیان۔ اس مقام کو عبور کرنا۔ چند اعتراضوں کا جواب۔

خداوند پاک جلّ وعلا ہمیں سید الانبیاء والمرسلین حضرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی متابعت پر دائماً قائم رکھے۔ ایک شخص نے جو آپ کی مجلس بابرکت میں موجود تھا بیان کیا کہ میاں شیخ نظام تھانیسری کے ایک درویش نے

کسی تقریب سے وہاں میرا بھی ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ وہ وحدتِ[1] وجود کا منکر ہے
یہ بھی اُس شخص نے مجھ سے التماس کی کہ میں اس مسئلہ کی حقیقت آپ کی خدمت
میں لکھ بھیجوں تاکہ لوگ خواہ مخواہ بدظن نہوں اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (ایک قسم
کا گمان گناہ بھی ہے) اُسنے یہ بھی کہا کہ اگر مفصل حقیقت کا اظہار نکیا جائیگا تو
معلوم نہیں لوگ تمہاری نسبت کیا خیال کرینگے اور اس فقرے کے کہنے سے
سامعین پر کیا اثر پڑا ہوگا کہ "فلاں شخص وحدت وجود کا منکر ہے"۔ بنابریں یہ
چند الفاظ لکھکر تصدیع دیتا ہوں۔

مخدوم ومکرم بندہ! میرا اعتقاد عہدِ طفولیت ہی سے مشرب اہل توحید کے
موافق تھا۔ میرے والد ماجد قدس اللہ تعالٰے سرہ لظاہر اسی اصول کے صوفی
تھے اور ہمیشہ اُن کا یہی شغل رہا۔ گو اون کا باطن بالکل مرتبۂ[2] بے کیف کیجانب
نگراں رہا کیا۔ مثل مشہور ہے کہ ابن[3] الفقیہ نصف الفقیہ۔ مجھکو بھی مشرب
توحید وجودی سے خاص دلچسپی بلکہ ازروئے علم بہرہ کافی حاصل تھا اور مجھ کو
اس پاکیزہ خیال سے لذتِ عظیم حاصل ہوتی تھی۔ بالآخر مجھکو حق تعالیٰ وتقدس

[1] وحدت وجود اور توحید وجودی ایک ہی بات ہے۔ مفہوم میں صرف اتنا فرق ہے کہ پہلا
لفظ مصدر لازم ہے اور دوسرا متعدی۔

[2] مرتبۂ بے کیف سے مراد ذات حق تعالٰے وتقدس کا بےچون وبے چگون ہونا ہے
جس کو کسوتِ مخلوق میں دیکھنے کی توقع کرنا اس کی شان قدوسیت وکبریائی کے سراسر
منافی ہے۔

[3] یعنے فقیہ کا بیٹا بغیر تعلیم وتعلم کے بھی آدھا فقیہ تو ضرور ہوتا ہے۔ امام صاحب کا مطلب
یہ ہے کہ چونکہ میرے والد ماجد ارباب توحید وجودی سے تھے اسلئے مجھے بھی وحدت وجود کا مذاق
وراثتاً ملا تھا اور اس مذاق سے مجھے خاص اُنس حاصل تھا +

کے محض فضل وکرم سے حضرت ارشاد پناہ حقائق آگاہ شیخنا ومولانا خواجہ محمد باقی باللہ قبلہ قدّسنا اللہ تعالےٰ بسرہ کا فیضِ صحبت میّسر ہوا۔ انہوں نے مجھکو طریقۂ علیہ نقشبندیہ کی تلقین فرمائی اور مجھ مسکین کے حال پر نہایت توجہ مبذول فرماتے رہے۔ تھوڑی مدت کے سلوک سے توحید وجودی کا انکشاف ہوگیا۔ اور یہ انکشاف غلوؔ کے حد تک پہونچ گیا۔ اس مقام کے متعلق بہت کچھ علوم اور معارف مجھ پر ظاہر ہوئے اور اس مرتبہ کے تمام دقائق اچھی طرح کھل گئے حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کو جو معارف توحید وجودی کے متعلق حاصل ہوئے تھے اُن کی باریکیاں بخوبی سمجھ میں آگئیں۔ میں اس تجلی ذاتی سے بھی مشرف ہوا جس کا بیان شیخ مذکور نے کتاب فصوص الحکم میں کیا ہے جس کو وہ عارف کیلئے منتہائے عروج خیال کرتا ہے اور کہتا ہے وما بعد ھذا الا العدم المحض (اس تجلی سے برتر اور بڑھ کر کوئی مقام نہیں۔ اسکے بعد عدمِ محض ہی کا رتبہ ہے) مجھ پر اس تجلی کے وہ علوم و معارف بھی مفصل طور پر القا کئے گئے جس کو شیخ موصوف اسرار مکتومہ خیال کرتا اور خاتم الولاٰیت[۱] کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہی اس توحید میں مجھ کو نہایت سکر اور غلبۂ حال حاصل ہوا یہاں تک کہ ایکدفعہ فرط سکر کی حالت میں میں نے مندرجہ ذیل رباعی اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں لکھی تھی ؎

اے دریغا کیں شریعت ملت اعمائی است[۲] ✤ ملت ما کافری و ملت ترسائی است

---

[۱] شیخ محی الدین ابن عربی کے قول کے مطابق جس طرح نبوت کا سلسلہ ہمارے پیغمبر محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا ہے اور اسلئے ان کو خاتم الانبیاء کہتے ہیں اسیطرح ولایت کا رتبہ سب سے آخر جس شخص کو حاصل ہوا ہے اور جو سب سے بڑھکر قرب و کمال رکھتا ہے وہ خاتم الولایت کے لقب سے موسوم ہے۔ یہ بھی انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ خاتم الولایت میں ہوں۔

[۲] افسوس ہے، کہ ہماری شریعت اندھوں کی شریعت ہے، (جس نے اصل حقیقت پر پردہ ڈال رکھا ہے) ہمارا مذہب اور ہمارا دین کفر اور نصرانیت ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک تو کفر اور ایمان

کفر و ایماں زلف و روئے آں پری زیبائی است ٭ کفر و ایماں ہر دو اندر راہ ما یکتائی است

یہ حالت ایک مدت دراز تک قائم رہی اور سالہا سال تک میں توحید وجودی کی چاشنی میں سرشار رہا یکایک عنایتِ کاملۂ الٰہی جلّ وعلا نے میری غیبی امداد فرمائی اور جو چیز اُس کے بیچون و بے چگون ہونے کا حجاب ہو رہی تھی اُس کو دور کر دیا۔ جو علوم و معارف وحدتِ وجود سے تعلق رکھتے تھے یکدم زائل ہو گئے۔ مقام مذکور میں جس احاطہ[1]۔ سریان۔ قرب۔ اور معیّت ذاتیہ کا انکشاف ہوا تھا وہ سب روپوش ہو کر کمال تیقّن کے ساتھ معلوم ہوا کہ صانع پاک جلّ وعلا کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) محبوب کے چہرے کی زلفیں اور رخ زیبا ہے اور ہمارے ہاں کفر و ایمان میں کچھ بھی تفاوت نہیں " چونکہ ارباب توحید وجودی تمام اشیاء میں وجود ذات حق تعالےٰ و تقدس کو ساری سمجھتے ہیں اسلئے وہ سب اشیا کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں اور جس طرح دریا کی ہر ایک موج بھی وہی دریا ہے جو ایک خاص شکل میں ظہور پذیر ہے (دریا اور موج میں کچھ بھی فرق نہیں۔ دریا ہی کا ایک حصہ خاص شکل اختیار کر لیتا ہے اور وہ موج کہلاتا ہے) اسی طرح وہ خیال کرتے ہیں کہ تمام مخلوقات دریائے وجود حق کی موجیں ہیں اور وہی ایک ہی ذات تعالےٰ و تقدس سب اشیاء میں جلوہ نما ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس قسم کے الفاظ کہنے میں تامل نہیں کرتے۔

[1] احاطہ: محیط ہونا۔ سریان: سرایت کئے ہوئے ہونا۔ قرب و معیت ذاتیہ سے یہ مطلب ہے کہ ذاتِ حق تعالےٰ و تقدس ہر ایک شخص کے ساتھ اور اس کے قریب ہے۔ اس عبارت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن کریم میں بھی احاطہ وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں مثلاً قرآن کریم میں ہے۔ اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ (خدائے پاک جلّ وعلا ہر ایک چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے) وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ (وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو) وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (جب میرے بندے تجھ سے میرا حال پوچھیں تو کہدے کہ میں ان کے بہت نزدیک ہوں) علماء کرام رحمہم اللہ تعالےٰ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ الفاظ محاورات عرب کے مطابق مجاز کے معنوں میں استعمال

عالم کے ساتھ اس قسم کی کوئی بھی نسبت نہیں جس احاطہ اور قرب کا کلام مجید میں ذکر ہے وہ باعتبار علم کے ہے جیسے کہ علمائے اہلسنت نے تحقیق فرمائی ہے۔ حق سبحانہٗ وتعالےٰ کو اپنی مخلوق میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی اتحاد نہیں خدا خدا ہے اور مخلوق مخلوق۔ خداوند پاک جل و علا بے چون و بے چگون ہے برخلاف اس کے عالم کی تمام اشیا اس عیب سے ہرگز مبرا نہیں ہوسکتیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جو چیز بے چون و بے چگون نہیں اوسپر عین بے چون و بے چگون کا اطلاق کریں؟ واجب[1] الوجود کو بعینہ ممکن الوجود سمجھنا کس قدر غلط ہے[2] قدیم اور حادث کا عین ہمہ گر ہونا ہرگز متصور نہیں جیسے کہ ممتنع العدم کا جائز العدم قرار دینا بالکل محال اور ناممکن ہے۔ کسی چیز کی حقیقت کا منقلب ہوجانا (مثلاً قدیم کا حادث ہوجانا یا بالعکس) کیا بلحاظ عقل اور کیا بلحاظ شرع ممتنع ہے۔ دو جداگانہ بالکل مختلف حقیقتوں کے مفہوم کا ایک دوسرے پر اطلاق کرنا کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ شیخ محی الدین ابن العربی اور اوس کے ہم مشرب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہوئے ہیں۔ احاطہ سے مراد یہ ہے کہ اس کا علم وسیع اور قدرت کاملہ ہر ایک چیز پر محیط ہے۔ معیت سے مراد معیت باعتبار علم کے ہے اور قرب سے بھی قرب علمی مراد ہے یہہ غلط اور باطل ہے کہ آیت اوّل الذکر سے اس کی ذات پاک کا ہر ایک چیز پر محیط ہونا سمجھا جائے اور پچھلی آیتوں سے اس کی ذات کے قرب و معیت کا مفہوم لیا جائے لیکن ارباب توحید وجودی کا اسی مفہوم پر اصرار ہے جس کی تردید امام صاحب نے اس عبارت میں فرمائی ہے۔

[1] قدیم اور حادث کے مفہوم کی توضیح پہلے کیگئی ہے۔ واجب الوجود اور ممکن الوجود سے بھی علی الترتیب قدیم اور حادث مراد ہے۔ علی ہذا القیاس ممتنع العدم صرف ذات و صفات حق جل و علا ہے جس پر عدم کا طاری ہونا کسی طرح متصور نہیں برخلاف اس کے تمام مخلوقات عالم جائز العدم ہے جس کا فنا ہوجانا ممکن بلکہ امر واقع ہے۔

[2] اس تمام تقریر کا حاصل یہ ہے کہ ذات باری تعالےٰ وتقدس قدیم و واجب الوجود بے چون و بے چگون ہے، برخلاف اس کے تمام مخلوق حادث ممکن الوجود اور ملوث بچون و چگون ہے اس لئے مخلوق کو عین خالق سمجھنا نہایت بیہودہ اور خلاف عقل و شرع و فطرت ہے۔ اور اس عقیدہ کا باطل ہونا ایک بدیہی بات ہے۔

ذاتِ مقدسۂ الٰہی جلّ وعلا کو مجہول مطلق[1] کہتے ہیں اور تصریح کرتے ہیں کہ وہ کسی حکم کی محکوم علیہ نہیں ہو سکتی باایں ہمہ قرب واحاطۂ ذاتی اور معیّت ذاتیہ کا اثبات کرتے ہیں۔ یہ ذاتِ مقدسہ کو محکوم علیہ بنانا نہیں تو اور کیا ہے؟ امر حق وہی ہے جس کو علمائے اہل سنت نے بیان فرمایا ہے۔ کہ قرب اور احاطہ ومعیّت باعتبار صفت علم الٰہی ہے جل سلطانہٗ جس زمانہ میں میں توحید وجودی کے مقام میں [illegible] ومعارف کے حصول سے مجھے سخت قلق واضطراب پیدا ہوتا تھا جن کو میں اس مشرب کے خلاف تصور کرتا تھا کیونکہ میرے خیال میں اس مقام سے بڑھکر اور کوئی زیادہ اعلےٰ رتبہ نہیں تھا۔ میں نہایت عاجزی اور تضرع کے ساتھ گڑ گڑا کر دعائیں مانگتا تھا کہ یہ معرفت (توحید وجودی) زائل نہ ہو۔ بالآخر وہ تمام حجاب دور کر دیئے گئے جو چہرۂ حقیقت کا نقاب بنے ہوئے تھے۔ اصل معرفت تک میں پہنچ گیا اور مجھے یقین کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ گویہ عالم اپنے خالق جلّ وعلا کے کمالاتِ صفات کا آئینہ اور اسکے اسمائے حسنےٰ کے حقائق کا مظہر ہے لیکن اہلِ توحید وجودی کے مذہب کے مطابق مظہر ہرگز عین ظاہر نہیں اور کسی چیز کے عکس کو اوس کا عین کہدینا صریحًا غلط ہے۔ اسکی توضیح ایک مثال سے ہو سکتی ہے مثلاً ایک بڑا متبحر اور جامع الکمالات عالم چاہتا ہے کہ اپنے کمالاتِ علمیہ کو تمام عالم پر ظاہر کرے تو لامحالہ وہ الفاظ ہی کے ذریعہ اُن کا اظہار کریگا۔ یہ الفاظ متکلم کی ایجاد ہیں

---

[1] اہل منطق وفلسفہ کی اصطلاح میں مجہول مطلق اس مفہوم کو کہتے ہیں جس کے متعلق کسی دوسرے مفہوم کا بوجہ من الوجوہ اثبات نہ کیا جا سکے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ مجہول مطلق کسی حکم کا محکوم علیہ نہیں ہو سکتا۔ یہ مسئلہ علم منطق کا ایک مشہور مشکل مسئلہ ہے اور اسمیں بھی بڑا اختلاف ہے کہ کیا مجہول مطلق ایک فرضی حقیقت ہے یا اس کا مصداق کہیں موجود بھی ہے؟ بہرکیف ابن عربی جو سرحلقۂ اربابِ توحید وجودی ہیں ذات حق کو مجہول مطلق کہتے ہیں۔ متن کی عبارت میں امام صاحب نے اُن کے اقوال کا تناقض دکھایا ہے۔

اور اوس کے کمالات علمیہ کا مظہر یا آئینہ ہیں لیکن ہم ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہ الفاظ اور کمالات عین ہمدگر ہیں یا ان کے آپس میں قرب و احاطۂ ذاتی یا معیت ذاتیہ کا علاقہ ہے۔ ان کے درمیان اگر کوئی علاقہ ہے تو یہ ہے کہ الفاظ دال ہیں اور کمالات مدلول۔ لیکن اس سے کمالات کے "صرافت[1] اطلاق" میں کچھ فرق نہیں آتا۔ اتحاد یا احاطہ یا معیت کا شبہ محض وہم ہے درحقیقت ان نسبتوں سے کوئی نسبت بھی ثابت نہیں۔ اس وہم باطل کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ ان الفاظ و کمالات کے درمیان ظاہر و مظہر اور دال و مدلول کی نسبت موجود ہے بنا برآں یہی نسبت چند عارضی وجوہ سے نسبتہائے مذکورہ کے ایہام کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت یہ کمالات ان تمام موہومہ نسبتوں سے مبرا ہیں بعینہٖ اسی طرح مسئلہ متنازعہ میں بھی خالق و مخلوق کے درمیان سوائے اس کے کوئی علاقہ نہیں کہ اول الذکر ظاہر ہے اور مخلوق اوس کا مظہر۔ مخلوق دال ہے اور خالق پاک جل وعلا مدلول۔ عالم کی وجہ تسمیہ یہی ہے کہ وہ وجودِ صانع باکمال کی ایک علامت ہے تعالےٰ و تقدس۔ الغرض بہ تطبیق مثالِ بالا چونکہ یہہ عالم کون و فساد حق سبحانہٗ و تعالےٰ کے اسمائے حسنےٰ اور صفاتِ علیا کے کمالاتِ مستورہ کا مظہر ہے اسلئے یہی علاقہ اور نسبت چند عارضی وجوہ سے بعض لوگوں کے حق میں نسبتہائے مذکورہ (احاطہ و قرب ذاتی۔ سریان اور معیت ذاتیہ) کے ایہام کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً مراقبہ[2] ہائے توحید کی کثرت کی وجہ سے انہیں مراقبات

---

[1] صرافت اطلاق سے مراد یہ ہے کہ وہ محض اپنی اطلاق پر ہیں انہیں کسی طرح کا تقید ظہور میں نہیں آیا۔

[2] اہل تصوف کی اصطلاح میں مراقبہ اس کو کہتے ہیں کہ ایک خاص امر کو مرکز تفکر قرار دیکر اپنی تمام تر توجہ اسپر صرف کرنے کی کوشش کریں مثلاً اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ یا هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ کا مفہوم پیش نظر رکھکر اور اپنی پوری توجہ اسپر مبذول کرکے تفکر کو وسعت دیں۔

کا تصور قوتِ متخیلہ میں منقوش ہو جاتا ہے (جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مظہر عین ظاہر دکھائی دیتا ہے) دوسری صورت یہ ہے کہ توحید وجودی کے مسائل کا تکرار اور توغل کے ساتھ اون مسائل کے مطالعہ میں منہمک ہوجانا اوس شخصِ منہمک میں احکام توحید وجودی کا ایک گونہ مذاق پیدا کر دیتا ہے لیکن توحید وجودی کی یہ دونوں صورتیں معلول اور ناقص ہیں۔ ان دونوں کو علمی توحید وجودی کہہ سکتے ہیں لیکن حالِ توحید وجودی کا اطلاق ان پر نہیں ہو سکتا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ یہ توحید اور اوس کے احکامِ متعلقہ غلبۂ محبت کی وجہ سے پیدا ہوں۔ محبوب حقیقی کی محبت کے غلبہ کے باعث غیرِ محبوب مطلق نظر نہ آئے۔ یہ نہیں کہ غیرِ محبوب نفس الامر میں بھی موجود نہیں کیوں کہ یہ بات تو عقل۔ شرع اور حس کے صریح خلاف ہے۔ اسی غلبۂ محبت اور غیرِ محبوب کے نظر نہ آنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ محبوب حقیقی جلّ وعلا کو محیط بالذات اور قریب بالذات سمجھنے لگتا ہے (یعنے احاطہ وقرب ذاتی اور معیت ذاتیہ کا قائل ہوتا ہے) یہ توحید پہلی دو قسموں سے اعلیٰ تر ہے اور گو یہ توحید بھی مطابقِ واقع اور موافق شریعت مطہرۂ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے نہیں لیکن پھر بھی دائرہ "حال" میں داخل ہے اور محض علمی نہیں ہے توحید وجودی کو شریعت کے ساتھ موافق بنانے اور مطابقِ واقع ثابت کرنے کیلئے جس قدر بھی کوشش کی گئی ہے محض تکلف ہی تکلف ہے۔ یہ بیہودہ تاویلیں بالکل اوسی طرح کی ہیں جو مسلمان نما فلسفیوں نے فلسفہ کے خلافِ شرع اور باطل اصول کو اصول شرعیہ کے ساتھ تطبیق دینے کیلئے تراشی ہیں۔ کتاب اخوان الصفا

جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ احاطہ اور معیت ذاتی کا خیال قوت متفکرہ میں منقوش ہو کر ہر ایک جگہ پر خلاج میں بھی اسکے آثار جلوہ دکھانے لگینگے۔ مزید تفصیل کیلئے القول الجمیل مصنفہ شاہ ولی اللہ صاحب یا احیاء علوم کی کتاب المراقبہ کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

اور اسی قسم کی اور کتابیں ان تکلف آمیز تاویلوں کا ایک نمونہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ کشف و الہام کی غلطی بھی اجتہادی غلطی[۵۱] کی طرح ناقابل مواخذہ ہے بلکہ ایک درجہ اجر و ثواب کا بھی حاصل ہوتا ہے۔ ہاں ان دونوں غلطیوں میں ایک نمایاں فرق بھی ہے۔ مجتہد شرعی اگر اجتہادی غلطی کر بیٹھے اور ایک دوسرا شخص جو اجتہاد کی قابلیت نہیں رکھتا ایک پیشوا کی حیثیت سے اس کی تقلید کرے تو اس مقلد پر بھی کچھ مواخذہ نہیں لیکن الہام اور کشف کی تقلید کسی طرح درست نہیں (گو خود صاحبِ کشف و الہام کو اس کی غلطی پر مواخذہ نہ ہو) اہل کشف کی تقلید بنا بر احتمالِ خطا ہرگز درست نہیں لیکن غیر مجتہد پر مجتہد کی تقلید باوجود احتمال خطا کے درست و جائز بلکہ واجب و لازم ہے۔

تعینات[۵۲] کونیہ کے آئینہ میں جو شہود بعض سالکوں کو حاصل ہوتا ہے اور جس کو وہ اپنی

---

[۵۱] اگر کوئی عالم باکمال جس کو مجتہد کہتے ہیں اپنی طرف سے حتے المقدور تتبع دلائل شرعیہ کر کے قرآن و حدیث کے مفہوم کی پیروی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے ایسی صورت میں اگر وہ غلطی بھی کرے تو یہ غلطی اس کی قابل مواخذہ نہیں۔ اس کو اجتہادی غلطی کہتے ہیں اور صحیح بخاری و مسلم میں ایک حدیث آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مجتہد جو اجتہاد کر کے قرآن و حدیث کے منشا کے مطابق حکم شرعی کا استنباط کرنے میں کامیاب ہو اسکے لئے دگنا اجر و ثواب ہے، لیکن اگر اس نے غلطی بھی کی تو وہ ایک درجہ اجر و ثواب کا تو ضرور مستحق ہے (بشرطیکہ اس نے اپنی طرف سے قرآن و حدیث کا صحیح مفہوم اخذ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ہو)

[۵۲] ارباب توحید وجودی کے اصول کے مطابق ذاتِ حق تعالےٰ و تقدس اس وقت میں جبکہ کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی تھی غیر متعین تھی لیکن جب عالم کو پیدا کیا اور اس کی ذات نے مخلوقات کے آئینہ میں مختلف صورتوں سے اپنا جلوہ دکھایا تو وہ متعین ہو گئی۔ ان مخلوقات کو جن کے وجود میں آنے کے باعث ذاتِ حق کو تعین حاصل ہوا تعینات کونیہ کہیں گے۔

اصطلاح میں "شہود وحدت در کثرت" اور "شہود احدیت در کثرت" کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ شہود بھی اسی طرح خلاف واقع اور خلاف شرع ہے کیونکہ ذاتِ واجب الوجود تعالےٰ و تقدس جو بیچون و بے چگون ہونے سے موصوف ہے کسی طرح چون و چگون سے موصوف ہونے والی اشیاء میں حلول نہیں کر سکتی لامکانی کو مکان میں قرار پذیر ہونے سے کیسے موصوف کر سکتے ہیں۔ بیچون و بے چگون کو چون و چگون کے دائرہ سے باہر طلب کرنا چاہیئے اور لامکانی کو مکان کے حدود سے باہر قدم رکھکر ڈھونڈنا لازم ہے۔ آفاق[1] و انفس میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے یہ سب اُس کی قدرت کاملہ کے آیاتِ باہرہ ہیں۔ سبحانہ و تعالےٰ و تقدس۔ قطب الاولیاء حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالےٰ سرہ فرماتے ہیں:۔ "جو کچھ بھی دیکھا گیا ہے یا سنا گیا ہے اور جس چیز کی معرفت حاصل ہوئی ہے یہ سب غیر اللہ ہے تعالےٰ و تقدس لہذا از بس ضروری ہے کہ حرف لا[2] کے ساتھ ایکدم ان کی نفی کر دینا چاہیئے"

در تنگنائے صورت معنی چہ گونہ گنجد ٭ در کلبۂ گدایاں سلطاں چہ کار دارد
صورت پرست غافل معنی چہ داند آخر ٭ کو با جمال جاناں پنہاں چہ کار دارد[3]

اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اکثر مشائخ طریقت حتّٰی کہ مشائخ نقشبندیہ سے بھی

---

[1] اس سے مراد سیر آفاقی اور سیر انفسی کے مشاہدات ہیں جنکا ذکر پہلے کسی ذیلی حاشیہ میں کیا جا چکا ہے۔

[2] اسکا مطلب یہ ہے کہ کلمہ توحید کے پہلے حصہ لا آلہ سے ہر ایک ایسے شہود کی جس پر غیر اللہ کا اطلاق ہوتا ہے نفی کر کے الا اللہ سے ایک ہی ذات پاک بیچون و بے چگون کا اثبات کرنا چاہیئے۔

[3] عالم صورت کی تنگ گذرگاہوں میں امور معنوی کی جو فسحت اور وسعت پر مبنی ہیں گنجائش نہیں۔ غریبوں کی جھونپڑی میں بادشاہ کا آنا ناممکن ہے۔ جو شخص صورت پرستی میں گرفتار ہے وہ اہل باطن نہیں ہو سکتا۔ اس کو محبوبِ حقیقی کے حسن و جمال باطنی سے کیا سروکار ہے۔

ایسی عبارتیں منقول ہیں جو صریحاً وحدت وجود۔ احاطہ و قرب ذاتی۔ معیت ذاتیہ
شہود وحدت در کثرت۔ یا احدیت در کثرت پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کا جواب
یہہ ہے کہ ممکن ہے یہ حال اور شہود اون کو اثنائے سلوک میں حاصل ہوا ہو
لیکن بعد میں وہ بزرگوار اس مقام سے عروج کر گئے ہوں گے چنانچہ خود مجھ کو
بعینہٖ یہی حالت پیش آئی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض بزرگوار ان طریقہ کے باوجودیکہ انکا باطن بالکل حضرت احدیت کی
جانب نگراں رہتا ہے لیکن اون کا ظاہر شہود وحدت در کثرت میں مشغول رہتا ہے
چنانچہ میرے والد بزرگوار اسی قسم کے عارف تھے جس کا ذکر اسی مکتوب کے
پہلے حصہ میں کیا گیا ہے۔ اس جواب کو اوس رسالہ میں زیادہ بسط و تفصیل اور تحقیق
کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس کو میں نے مراتب وحدت وجود کے موضوع پر لکھا ہے۔
یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ یہ بھی ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ جب کہ
نفس الامر میں وجود کو وحدت حاصل نہیں بلکہ متعدد وجود ہیں۔ قرب و احاطہ ذاتی
خلاف واقع ہے اور شہود وحدت در کثرت بھی مطابق واقع نہیں تو ان بزرگوار
(قائلان توحید وجودی) کے یہ سب احکام جس کا وہ نہایت شدّ و مدّ کے ساتھ
اثبات کرتے ہیں امر واقع کے خلاف ثابت ہوئے اور اس لئے یہ بزرگوار زمرہٗ
کاذبین میں شامل کئے جانے کے مستحق ہیں (کذب کی حقیقت اس سے بڑھکر
نہیں کہ ایک قول غیر مطابق واقع ہو) اس کا جواب یہہ ہے کہ ان بزرگواروں
کے یہہ احکام اندازۂ شہود کے موافق ہیں اور مبنی بر شہود ہونے کی وجہ سے
ان احکام کو کاذبہ نہیں کہہ سکتے گو فی نفسہٖ غیر مطابق واقع کیوں نہوں۔
مثلاً ایک شخص اپنے شہود کے موافق ایک حکم قطعی کی شکل میں یہہ کہدیتا ہے کہ
مینے زید کی صورت کو آئینہ میں دیکھا حالانکہ یہ حکم مطابق واقعہ نہیں اور اسنے
آئینہ میں زید کی صورت و شکل کو حقیقتاً ہرگز نہیں دیکھا۔ کیونکہ آئینہ میں زید

کی صورت نہیں بلکہ اس کا ایک خیالی عکس موجود ہے (جیسا کہ ماہران علم المناظر والمرایا سے پوشیدہ نہیں) تو زید کی صورت کا دیکھنا کیسا؟ الغرض اگرچہ یہہ حکم مطابق واقع ونفس الامر نہیں لیکن وہ اپنے شہود کے لحاظ سے ایسا حکم کرنے پر مجبور ہے لہذا وہ معذور ہے۔ اس حالت میں اوس کو ہرگز کاذب نہیں کہیں گے اور کسی طرح بھی وہ لائق ملامت نہیں۔ ان قابل اخفا احوال واسرار کا اظہار کرنے سے مطلب یہہ ہے کہ میں اگر وحدت وجود کا قائل تھا تو یہ تسلیم واعتراف کسی کورانہ تقلید کی وجہ سے نہیں بلکہ کشف پر مبنی تھا اور اگر اب انکار ہے تو بھی الہام وکشف پر مبنی ہے۔ گو یہ مسلّم ہے کہ کشف والہام دوسروں کے لئے قابل پذیرائی حجّت نہیں۔ دوسرا جواب اعتراض مندرجہ بالا کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس طرح مختلف انواع واجناس عالم بعض اوصاف کے لحاظ سے آپس میں اشتراک رکھتے ہیں لیکن بعض دوسرے امور کے لحاظ سے اون کے درمیان تباین وامتیاز قائم ہے اسی طرح ممکن الوجود اور واجب الوجود کا مفہوم ہرچند ایکدوسرے سے بالذات مختلف ہے لیکن بعض عارضی امور کے لحاظ سے اون میں اشتراک بھی پایا جاتا ہے اور اسلئے غلبۂ محبت کی حالت میں وہ مابہ الامتیاز نظر سے محجوب ہوکر صرف مابہ الاشتراک باقی رہتا ہے جس کی وجہ سے اگر ممکن اور واجب کو عین ہمدگر سمجھ کر وحدتِ وجود کا حکم کردیا جائے تو اس کو کذب ہرگز نہیں کہیں گے۔ احاطۂ ذاتی وغیرہ احکام کو بھی اسی کے موافق تاویل کریں +

بارہواں مکتوب (۴۲)

(مرزا حسام الدین کے نام لکھا گیا)

(اُس کمال کا بیان جو آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام سے مخصوص ہے۔)

آپ کا عنایت نامہ وصول پایا۔ خداوند پاک جلّ وعلا کا شکر ہے کہ آپ نے ہم جیسے دور افتادوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔ اور کسی نہ کسی تقریب سے ہمیں یاد کر ہی لیتے ہیں ؎

بارے بہیچ خاطر خود شاد میکنم

آپ نے لکھا تھا کہ حضرت پیر دستگیر خواجہ محمد باقی علیہ الرحمۃ کی "نسبتِ[1] خاصہ" کی حقیقت دریافت نہیں ہوتی۔ کیا باعث ہے؟ مخدوم من! ایسی باتوں کی شرح وتفصیل بذریعہ تحریر تو کجا بالمشافہ کرنی بھی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ کوئی کیا سمجھے اور کیا بہرہ حاصل کرے۔ اس قسم کے معارف وحقائق حاصل کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ پیر طریقت کی خدمت میں حسنِ ظن کے ساتھ حاضر ہو یا جس طرح بن پڑے ایک طویل مدت تک اوس کی صحبت میں رہے۔ اس کے بغیر گوہر مقصود کا ملنا سخت دشوار ہے ؎

پاکیزہ[2] شبے باید وخوش مہتابے ٭ تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

---

[1] نسبت کا مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ نسبت خاصہ سے وہ مخصوص نسبت مراد ہے جو حضرت خواجہ کو حاصل تھی کیونکہ ہر ایک عارف کی نسبت جداگانہ ہوا کرتی ہے۔

[2] ایک پاکیزہ فرحت بخش رات ہو اور چاندنی کی خوشنما چادر صفحۂ عالم پر بچھی ہوئی ہو تب میں تم سے ہر ایک قسم کی باتیں کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالوں۔

لیکن چونکہ آپ نے استفسار کیا ہے اسلئے بحکم ضرورت مختصر جواب لکھا جاتا ہے۔
ہر ایک مقام کے علوم و معارف جداگانہ ہیں۔ اسیطرح احوال اور مواجید[1] بھی مختلف
ہوتے ہیں۔ ایک مقام میں ذکر اور توجہ کا شغل مناسب ہے تو دوسرے میں تلاوتِ
قرآن اور نماز کی کثرت سے کشود کار ممکن ہے۔ علیٰ ہذا ایک مقام جذبہ (سیر انفسی)
کے ساتھ مخصوص ہے تو دوسرا سلوک (سیر آفاقی) کے مناسب حال ہے
لیکن تیسرا ایسا بھی ایک مقام ہے جس میں جذبہ و سلوک دونوں کا امتزاج ہے۔
ایک مقام ان تینوں سے الگ ہے، نہ اوس کو جذبہ سے تعلق ہے نہ سلوک سے علاقہ
یہ مقام نہایت اعلیٰ اور عزیز الوجود ہے۔ آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
کے اصحابِ کرام کو اسی مقام کی دولت کبرےٰ سے مشرف کیا گیا تھا جس کو یہ
مقام نصیب ہوا وس کو دیگر اربابِ مقامات سے امتیاز تمام حاصل ہوتا ہے۔ اس
مقام پر فائز ہونے والے افراد آپس میں بہت کم مشابہ ہوتے ہیں لیکن دوسرے
مقامات والوں میں ضرور مشابہت پائی جاتی ہے گو وہ مشابہت کلّی نہو۔ صحابِ
کرام کا زمانِ فیض نشان گذر جانے کے بعد یہہ نسبت عالیہ حضرت امام مہدی
علیہ السلام میں کامل ترین صورت میں ظہور پذیر ہوگی۔ اس مقام کے نفسِ
وجود کے متعلق بھی بہت کم مشائخ نے لب کشائی کی ہے چہ جائیکہ اس مقام کے
علوم و معارف بیان کئے ہوں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو
الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ اصحاب کرام کو یہہ عزیز الوجود نسبت

---

[1] مواجید جمع وجدان کی ہے علے خلاف القیاس۔ احوال سے یہی اصطلاحی احوال مراد ہیں۔
کسی خاص مقام یا حال میں جو مخصوص کیفیت ادراک ہوتی ہے اس کو وجدان کہتے ہیں۔ احوال و
مواجید کی زیادہ تشریح لفظوں میں نہیں ہوسکتی کیونکہ تصوف کے تمام تر امور اس قسم کے ہیں جنکی حقیقت
عبارت میں اچھی طرح نہیں ظاہر کی جاسکتی۔ تصوف کا زیادہ تر تعلق قال سے نہیں بلکہ حال سے
ہے ؎ لذت مے نشناسی بخدا تانہ چشی۔

پہلے قدم پر حاصل ہو کر بتدریج معراج کمال پر صعود نصیب ہوتا۔ برخلاف اس کے کسی دوسرے کو یہ سعادت عظمیٰ حاصل ہونے کی یہ صورت ہے کہ اصحاب کرام کی نسبت عالیہ کے طرز پر اُسکی تربیت کی جاتی ہے اور جب وہ منازل جذبہ اور مراحل سلوک کو طے کر لیتا ہے اُن کے علوم و معارف سے بخوبی لذت آشنا ہو جاتا ہے تب وہ اس سعادتِ عظمیٰ سے مشرف کیا جاتا ہے۔ اوّلِ ابتدائے سلوک میں اس نسبت عالیہ کا حاصل ہونا گو آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکتِ صحبت کا مخصوص نتیجہ ہے لیکن ممکن ہے کہ اُن کی امت کریمہ میں بھی کوئی ایسا مرد کامل پیدا ہو جائے جس کی صحبت میں یہی اثر ہو کہ سلوک کے آغاز ہی میں یہ نسبت ظہور پذیر ہو ؎

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید[1] دیگراں ہم بکنند آں چہ مسیحا میکرد

اس وقت اس نسبت میں بھی اندراج النہایۃ فی البدایۃ[2] کا مفہوم متحقق ہوتا ہے جیسے کہ اُس صورت میں متحقق ہوتا ہے جبکہ جذبہ سلوک پر مقدم ہو اس سے زیادہ کہنے کی گنجائش نہیں ؎

وَمِنْ بَعْدِ هٰذَا مَا يَدِقُّ صِفَاتُهٗ[3] وَمَا كَتْمُهٗ اَحْظٰى لَدَيَّ وَاَجْمَلُ

کسی وقت اگر ملاقات میسر ہوئی اور معلوم ہوا کہ سامعین طریق احسن پر سننے کیلئے آمادہ ہیں تو اس مقام کے متعلق کسی قدر وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے گا انشاء اللہ تعالےٰ وہو سبحانہ الموفق۔

بعض دوستوں کے بارہ میں آپنے سفارش لکھی ہے۔ میں نے اُن کی غلطیاں

---

[1] اگر روح القدس (جبریل علیہ السلام) کا فیض اعانت فرمائے تو کچھ تعجب نہیں کہ دوسرے لوگ بھی وہی اعجاز دکھانے لگیں جو حضرت مسیح دکھاتے تھے۔

[2] لفظی معنی انتہا کو ابتدا میں درج کر دینا یعنے ابتدا میں وہی کمال حاصل ہوتا جو دوسروں کو انتہائی سلوک میں میسر آتا ہے۔

[3] (ترجمہ) اسکے بعد وہ باتیں پیش آتی ہیں جن کو عبارت میں بیان کرنا دشوار ہے اور جن کا چھپا رکھنا میرے نزدیک بہت مناسب اور احسن ہے۔

معاف کردی ہیں۔ خداوند جل وعلا ارحم الراحمین ہے وہ بھی اُن کو اپنی بخشش سے بہرہ ور فرمائے۔ لیکن اون کو پند ونصائح کے ذریعہ فہمائش فرمائیں کہ خواہ وہ حاضر ہوں یا غائب کسی حالت میں بھی درپئے ایذا انہوں اور اپنی وضع ہرگز نہ بدلیں اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِقَوْمٍ سُوْٓءً فَلَا مَرَدَّ لَہٗ وَمَا لَہُمْ مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّالٍ۔ (خداوند پاک جل وعلا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جبتک وہ خود اپنی حالت نہ بدلیں اور جب خداوند پاک جلّ وعلا کسی قوم پر مصیبت نازل کرنا چاہتا ہے تو کوئی بھی اس کو نہیں ہٹا سکتا۔ اور سوائے خداوند پاک جلّ وعلا کے کوئی بھی اُنکی اعانت و دستگیری نہیں کر سکتا) آپنے میاں شیخ الہداد کے بارہ میں بالخصوص لکھا تھا۔ مجھے اسبارہ میں کچھ بھی تشدّد نہیں لیکن بہرحال اُن کو چاہیئے کہ اپنی تغیر وضع پر اظہار ندامت کریں الندم توبۃٌ (اظہار ندامت کرنا ہی توبہ ہے) وسیلہ تلاش کرنا اور سفارش کرانا ندامت کا ثبوت ہے۔ بہرکیف میں اپنی طرف سے عفو اور درگذر کے مقام میں ہوں۔ دوسری طرف کا سررشتۂ اختیار آپکے ہاتھ میں ہے۔ سرہند کو اپنا گھر خیال فرمائیں۔ محبت کا زبردست تعلق اور ہم پیر ہونے کا مضبوط و مستحکم رابطہ اس قسم کا نہیں کہ عارضی باتوں سے زائل ہو سکے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ مکتوب لکھ چکنے کے بعد مجھے خیال پیدا ہوا کہ جن احباب کی بابت آپنے سفارش کی ہے اُن کے متعلق کسی قدر زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھوں۔ مجمل لکھنے سے ممکن ہے بات کی حقیقت اچھی طرح سمجھ میں نہ آئے۔

مخدوما! معافی صرف اوس صورت میں ہوسکتی ہے کہ وہ لوگ اپنے روّیہ کو قبیح و مذموم خیال کریں اور جو حرکات ناشائستہ اون سے سرزد ہوئے ہیں اُنپر نادم ہوں۔ نہیں تو معاف کرنا محال ہے آپنے لکھا ہے کہ ان لوگوں کی شہادت

کے مطابق حضرت پیر دستگیر قدس سرہٗ نے یہ منصب[۱] شیخ الہداد کو تفویض فرمایا تھا یہ بات تفصیل طلب ہے۔ اگر تفویض منصب سے یہ مطلب ہے کہ درویشوں اور دوسرے آنے جانے والوں کی خدمت کیا کرے اور ان لوگوں کے کھانے پینے کا اہتمام رکھے تب تو بے شک مسلّم ہے لیکن اگر تفویض منصب کے یہ معنے ہیں کہ وہ طالبان حق کی روحانی تربیت کریں اور شیخ الطریقت کہلائے تو میں ہرگز تسلیم و اعتراف کرنے کیلئے آمادہ نہیں۔ پہلی مرتبہ جب میری ملاقات حضرت پیر دستگیر قدس سرہٗ سے ہوئی تھی تو انہوں نے فرمایا تھا کہ تم یہ تجویز کرو کہ شیخ الہداد ہماری طرف سے جا کر بعض طالبان حق کو اشغالِ[۲] طریقت بتائیں اور ان کے احوال سے ہمیں مطلع کیا کریں کہ ہم خود اسقدر تکلیف کے متحمل نہیں ہو سکتے کہ انہیں اپنے حضور میں طلب کریں ان کو اشغالِ طریقت کی تلقین کریں اور ان کے احوال پوچھا کریں۔ مجھے تو اس تجویز کے ساتھ اس وقت بھی اتفاق کرنے میں تامل تھا لیکن بحکم ضرورت میں نے رضامندی ظاہر کی اس قسم کی تبلیغ کو خلافت سے کچھ تعلق نہیں۔ ایسا شخص سفیر محض ہوتا ہے خصوصاً جب اس کی بنا ضرورت پر ہو اور صاف ظاہر ہے کہ جس چیز کی بنا ضرورت پر ہے اس

---

[۱] "یہ منصب" کا اشارہ منصبِ خلافت اور تلقین و ارشاد کی طرف ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ شیخ الہداد نے مریدوں کو تلقین کرنا اور دوسرے امور متعلق خلافت کو عمل میں لانا شروع کیا تھا جس پر امام صاحب نے اعتراض کیا اور تنفّر و ناراضگی تک نوبت پہونچ گئی۔ شیخ الہداد اور اس کے ہمخیالوں نے امام صاحب کو بُرا بھلا کہا۔ اس مکتوب میں انہی باتوں کا ذکر ہے۔

[۲] اشغال جمع شغل کی ہے۔ اصل معنے مطلق مصروفیت کے ہیں۔ لیکن اہل تصوف کی اصطلاح میں اشغال سے ذکرِ الٰہی کے وہ مختلف طریقے مراد ہوتے ہیں جو وہ اپنے اپنے اصول کے مطابق طالبانِ راہِ حق کو یکے بعد دیگرے تلقین فرماتے ہیں۔ مراقبہ وغیرہ بھی اسی مفہوم میں داخل ہے۔ علیٰ ہذا احوال سے بھی اصطلاحی احوال مراد ہیں عام کیفیت مراد نہیں۔

ضرورت کے زائل ہونے پر وہ چیز کسی مصرف کی نہیں رہیگی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہہ ہے کہ شیخ الامداد کی سفارت حضرت پیر دستگیر قدس سرہ کے زمانہ حیات تک محدود ہو۔ انکا ارتحال ہو جانے کے بعد اشتغال طریقت کی تلقین کرتے رہنا اور طالبان راہ حق کی خبر گیری کرنا خیانت ہے۔ آپنے لکھا تھا کہ حضرت پیر دستگیر قدس سرہٗ کی نسبت قائم رہے اور اوس میں کسی قسم کی کمی وبیشی نہونے پائے۔ مخدوم من! ہر ایک علم وفن کی تکمیل تلاحق افکار[1] کا نتیجہ ہے۔ علم نحو کو جس صورت میں سیبویہ نے وضع کیا تھا متاخرین نے اس کو دس گنا ترقی پر پہونچا دیا ہے۔ کسی فن کا اسی ابتدائی حالت میں رہنا نقص محض ہے۔ جو نسبت حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہٗ کو حاصل ہوئی وہ حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی قدس سرہٗ کے زمانہ میں ابھی معرض ظہور میں بھی نہیں آئی تھی۔ وعلیٰ ہذا القیاس مزید برآں حضرت پیر دستگیر قدس سرہٗ خود تکمیل نسبت کی فکر میں تھے اور اوس کو کامل نہیں تصور نہیں کرتے۔ اگر کچھ دنوں تک اور زندہ رہتے تو معلوم نہیں خداوند پاک جل وعلا کے حکم وارادہ سے اس نسبت کو کہاں سے کہاں تک پہونچا دیتے الغرض۔ یہہ کوشش کرنا مناسب نہیں کہ اوس میں کسی قسم کی زیادتی نہو۔ علاوہ ازیں میں نہیں سمجھتا کہ یہہ نسبت بعینہ اصلی صورت میں کس طرح قائم رہ سکتی ہے حالانکہ خود آپ کی نسبت بھی اس نسبت سے بالکل مختلف ہے اور یہ بات کئی دفعہ

---

[1] تلاحق افکار کا یہ مطلب ہے کہ ایک شخص کے فکر سے دوسرے کا فکر ملکر کسی بات کی تکمیل میں ایکدوسرے کے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مثل مشہور ہے تکمیل الصناعات بتلاحق الافکار یعنے تمام علوم وفنون کا درجہ کمال تک پہونچنا تلاحق افکار کا نتیجہ ہے۔ پہلے ایک شخص کسی فن کے چند اصول دریافت کرکے اس کی بنیاد ڈالتا ہے پھر دوسرے اہل فن اس کے اصول کو پیش نظر رکھکر اپنی تحقیقات اسپر اضافہ کرتے ہیں۔ اسیطرح ہوتے ہوتے وہ فن ایک نہایت

حضرت پیر دستگیر قدس سرہ کے حضور میں تشخیص ہو چکی ہے۔ شیخ الہداد بیچارے
کو کیا معلوم کہ نسبت کی کیا حقیقت ہے البتہ ایک خفیف سا حضور دل اوس کو حاصل
ہوا تھا (جس کو وہ تصوف کی تمام کائنات سمجھتا رہا)۔ دوسرے لوگوں کو بھی یہہ
حال بخوبی معلوم ہے۔ یہہ تو بتائیں کہ اس نسبت کا قائم رکھنے والا کون ہے کہ
میں بھی اس کا ہاتھ بٹاؤں۔ واقعات؎ پر کچھ بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کی بنا
محض تخیل پر ہے اور حقائق سے یہہ کوسوں دور ہیں۔ شیطان ایک بڑا طاقتور
دشمن ہے جس کے دام فریب سے محفوظ رہنا نہایت دشوار ہے۔ ہاں خداوند پاک
جل و علا کی عصمت و توفیق شامل حال ہو تو یہہ اور بات ہے۔ آپنے حاصل شدہ
نسبتوں کے زائل ہو جانے کے بارہ میں لکھا تھا۔ مخدوم من! جیسے کہ بالمشافہ ذکر
ہوا تھا یہہ سلب نسبت ارادۃً نہیں تھا۔ اب بھی وہی حالت ہے جس میں کوئی
تغیر واقع نہیں ہوا۔ یہہ خیال کہ محض توہم ہے کہ اب وہ سلب نسبت کی حالت
نہیں رہی۔ جو آواز دل سے سنائی دیتی ہے اس کو اوس حالت سے کچھ تعلق نہیں
جب دھکتے کوئلے کو پانی کے چھینٹے ڈال کر بجھا دیا جاتا ہے اوس وقت بھی اس سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) طویل الذیل مضمون کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے ہر ایک پہلو پر کافی
روشنی پڑتی جاتی ہے اس کے اصول و فروع مرتب ہو کر تمام باتوں کی تحقیق ہو جاتی ہے اور وہ فن تدریج کے ساتھ درجہ
کمال تک پہونچتا ہے۔ یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ کوئی علم یا فن ابتدا ہی سے درجہ کمال میں ظہور میں آئے اور اس میں
کسی طرح کی کمی و بیشی یا تحقیق کی گنجائش نہو۔ امام صاحب تصوف اور کسب طریقت کو بھی اسی ذیل میں
لینا چاہتے ہیں اور اس کو بھی اس عام قاعدہ سے مستثنے نہیں فرماتے۔ نسبت کا لفظ جو اس مکتوب میں
جا بجا مذکور ہے اس سے وہی اہل تصوف کی اصطلاحی نسبت مراد لیں۔ بلکہ عام طور پر یہہ نکتہ یاد رکھیں کہ
مکتوبات شریف میں عموماً اس قسم کے الفاظ مثلاً احوال و اشتغال نسبت وغیرہ اصطلاحی معنوں
استعمال ہوئے ہیں

؎ واقعات جمع واقعہ کی ہے جس کے اصطلاحی معنے کسی گزشتہ ذیلی حاشیہ میں بتا دیئے گئے ہیں۔

سننی کی آواز سنائی دیتی ہے جو اسبات کی ہرگز دلیل نہیں کہ اوس میں ابھی تک آگ موجود ہے۔ الغرض نتائج پر کچھ اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر اسبات کے تسلیم کرنے میں آج آپکو تامل ہے تو ذرہ اور صبر کیجیئے کل کو انشاء اللہ تعالےٰ اس حقیقت کا انکشاف ہو جائیگا۔ چونکہ آپنے نہایت تاکید کے ساتھ لکھا تھا بحکم ضرورت جواباً کچھ نہ کچھ لکھدیا گیا ورنہ بے تقریب کچھ کہنا مشکل ہے ؛

تیرہواں مکتوب (۳۳)

(ملا حاجی محمد لاہوری کے نام لکھا گیا)

{دنیا طلب عالموں کی مذمت ۔ علماء آخرت کی مدح وترغیب}

دنیائے دون کے ساتھ محبت رکھنا اور اوس میں راغب ہونا علماء دین کے چہرہ حسن وجمال پر ایک نہایت بدنما دھبہ ہے۔ اگرچہ دوسرے لوگوں کو انکی ذات سے بڑی بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں لیکن اُنکے اپنے حق میں اُنکا علم کچھ بھی مفید ثابت نہوا۔ اور گو اون کے وجود سے دین اور شریعت کی اشاعت وتقویت متصور ہے لیکن یہ بات خود اون کیلئے موجب حصولِ شرف نہیں۔ شریعت غراء کی تقویت اہل فسق وفجور کے نفوس خبیثہ سے بھی متصور ہے۔ چنانچہ سیدالانبیاء آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقعہ پر ایک فاجر مرد کے حق میں فرمایا تھا اِنَّ اللّٰہَ لَیُؤَیِّدُ ھٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ (ضرور خداوندپاک جل وعلا بعض اوقات ایک مرد فاجر سے بھی تقویت دین کا کام لے لیتا ہے) ان عالمانِ بے عمل کی مثال سنگ پارس کی ہے جو لوہے اور تانبے کو تو اپنے اتصال سے زر سرخ کی صورت میں تحویل کر دیتا ہے مگر بذات خود اوس کی وقعت ایک پتھر سے زیادہ نہیں۔ علےٰ ہذا وہ آگ جو پتھروں اور بانسوں میں قدرت نے

ودیعت کر رکھی ہے کہ ایک دنیا اوس سے مستفید ہوتی ہے۔ لیکن خود پتھر اور بالش کو اوس کی خبر تک نہیں بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ علم اونکے اپنے حق میں نافع ہونا تو درکنار اتمام حجت کی وجہ سے اور بھی سخت مضر ثابت ہوا اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ عَالِمٌ لَمْ یَنْفَعْہُ اللّٰہُ بِعِلْمِہٖ (قیامت کے دن اس عالم کو سخت ترین عذاب میں مبتلا کیا جائیگا جو اپنے علم سے مستفید نہیں ہوا) کوئی وجہ نہیں کہ اس قسم کا علم مضر نہ ثابت ہو۔ علم جیسے شریف جوہر کو جو خداوند پاک جلّ و علا کے نزدیک ایک عزیز ترین مایہ اور اشرف موجودات ہے۔ مال وجاہ اور ریاست دنیاوی کا ذریعہ قرار دینا جو خداوند پاک جلّ و علا کے ہاں نہایت حقیر و ذلیل اور بدترین مخلوقات ہے اور جو چیز خداوند پاک جلّ و علا کے نزدیک عزیز ہے اس کو ذلیل کر کے جس چیز کو خداوند پاک جلّ و علا نے ذلیل قرار دیا ہے اوس کو عزیز بنانا کتنی قبیح اور مذموم بات ہے۔ درحقیقت یہ خداوند پاک جلّ و علا کے ساتھ معارضہ کرنا اور اوس کے احکام کو اولٹانا ہے (جس سے بڑھکر کوئی جرم اور بغاوت نہیں) تدریس علوم اور بیان احکام شرعیہ اُسوقت مفید ہے کہ اوس میں خالص خوشنودی الٰہی تعالےٰ و تقدس نصب العین اور مطمح نظر ہو۔ جاہ و ریاست دنیاوی کی محبت اور حصول مال و رفعت کی رغبت سے نیّت صاف ہو۔ اس خلوص کی علامت یہ ہے کہ دنیا و ما فیہا سے دل سرد ہو جائے۔ جو علماء دنیائے دوں کی محبت میں مبتلا ہیں وہ محققین کے نزدیک علماء دنیا کہلاتے ہیں۔ انہی لوگوں کو علماءِ سُوء کہتے ہیں اور یہی جماعت بدترین نوع انسان اور رہزنان دین اسلام ہیں گو وہ اپنے تئیں مقتدا و پیشوائے دین اور بہترین نوع انسان کیوں نہ سمجھیں۔ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ عَلٰی شَیْئٍ۔ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْکَاذِبُوْنَ۔ اِسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمُ الشَّیْطَانُ فَاَنْسَاھُمْ ذِکْرَ اللّٰہِ۔ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطَانِ۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطَانِ ھُمُ الْخَاسِرُوْنَ۔ سیپارہ ۲۸۔

سورہ مجادلہ رکوع ۳۔ (وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ ہوشیار ہو جاؤ ضرور یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ شیطان نے اون پر غلبہ پاکر ان کو خدا کی یاد سے برگشتہ کر دیا ہے یہی لوگ شیطان کا گروہ ہے۔ یہ یاد رکھو کہ شیطان ہی کا گروہ گھاٹے میں رہیگا) ایک بزرگوار نے مکاشفہ کی حالت میں شیطان ملعون کو دیکھا کہ لوگوں کی اغوا و تضلیل سے بے فکر ہو کر فارغ البال بیٹھا ہے۔ وجہِ فراغت کے استفسار کرنے پر شیطان نے جواب دیا کہ اس زمانہ کے علماء دنیا طلب نے (علماء سوء) میرا خوب ہاتھ بٹایا اور یہی میری فراغت کا باعث ہے سچ پوچھیں تو جسقدر بھی امور شرعیہ میں سستی اور کمزوری ظہور میں آئی ہے اور جس قدر بھی دین و ملت کی ترویج میں فتور واقع ہوا ہے یہ سب کچھ علماء سوء کی شرارت اور انہی کی فسادنیت کا نتیجہ ہے۔ بے شک جن علماء کرام کو دنیائے دون سے رغبت نہیں۔ جو محبتِ جاہ و ریاست کے دلدادہ و مفتون نہیں۔ جن کو حصولِ مال و رفعت کی ذرہ بھی پروا نہیں وہ علماء آخرت ہیں۔ یہی لوگ وارثانِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ یہی جماعت بہترین خلائق اور بنی نوع انسان کا زبدہ ہے۔ یہی لوگ ہیں جنکی سیاہی کو کل قیامت کے دن شہدا فی سبیل اللہ کے خون کے ساتھ ایک ہی میزان میں رکھکر وزن کیا جائیگا لیکن پھر بھی اُن کی سیاہی کا پلڑا بھاری رہیگا۔ نوم العلماء عبادۃ (علماء کرام کی نیند بھی عبادت میں داخل ہے) انہی کے حق میں وارد ہے یہی حقیقت شناس تو ہیں جنکی چشم بصیرت نے آخرت کے حسن و جمال کو بخوبی ادراک کر لیا ہے۔ دنیا کی قبح اور شناعت کو انہوں نے اچھی طرح مشاہدہ کر لیا ہے اول الذکر کو انہوں نے باقی اور لازوال پایا لیکن موخر الذکر کا بے ثبات اور فانی ہونا اون پر ثابت ہوا اسلئے باقی کو فانی پر ترجیح دی اور اوسیکے لئے اپنے تئیں وقف کیا۔ آخرت کی عظمت دل میں بیٹھ جانا اسبات کا ثبوت ہے کہ

خدائے لایزال کی عظمت وجلال کا نقشہ آنکھوں میں سمایا ہوا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا ومافیہا کو تحقیر اور ذلت کی نظروں سے دیکھے۔ دنیا اور آخرت کی مثال دو بیویوں کی ہے ایک کی طرف راغب ہونا دوسری بیوی کیلئے موجب برافروختگی ہے اگر کسی شخص کے نزدیک دنیا عزیز ہے تو یقیناً آخرت کو وہ ذلیل سمجھتا ہوگا۔ برعکس اس کے اگر دنیا کو وہ ذلیل وحقیر خیال کرتا ہے تو اس کے دل میں آخرت کی عظمت اور وقعت ضرور ہوگی۔ لیکن دونوں کو عزیز رکھنا جمع بین الضدین کی قسم سے ہے (ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں ۔ ایں خیال است ومحال است وجنوں)[1] بے شک بعض مشائخ اور بزرگانِ دین جنہوں نے اپنے اختیار اور ارادہ کو بالکل چھوڑ کر تمام امور میں اپنے تئیں ارادہ ورضائے الٰہی تعالےٰ وتقدس کے تابع کر دیا ہے بعض اوقات نیات حقانیہ سے تحریک پاکر بظاہر اہل دنیا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ایک ظاہر بین کو اُن پر مائل بہ دنیا ہونے کا شبہ ہو سکتا ہے لیکن درحقیقت ان کے دل غیر اللہ سبحانہ وتعالےٰ کے تعلق سے بالکل آزاد ہیں۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکو تجارت کا کاروبار اور معاملات خرید وفروخت یادِ خدا جل وعلا سے مانع نہیں اور عین تعلق کی حالت میں بھی اُنکا باطن محض بے تعلق ہوتا ہے۔ حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ تعالےٰ سرہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے منےٰ[2] کے بازار میں ایک تاجر کو دیکھا جس نے تقریباً پچاس ہزار دینار کا بیوپار کر رکھا تھا لیکن ایک لحظہ بھی اوسکا دل یادِ الٰہی جل وعلا سے غافل نہیں رہا۔

---

[1] تو خدا کو بھی چاہتا ہے اور کمینہ دنیا سے بھی محبت رکھتا ہے۔ یہ خیال محال ہے اور ایک قسم کی دیوانگی ہے۔

[2] منےٰ ایک مقام کا نام ہے جو کہ معظمہ کے قریب تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے جہاں حاجی لوگ قربانی کرتے ہیں

چودہواں مکتوب (۱۴)

(ملا حاجی محمد لاہوری کے نام لکھا گیا)

{ عالم امر کے جواہر خمسہ کا شرح و مفصل بیان }

اسمیں ذرا بھی شک نہیں کہ دونوں جہانوں کی سعادت سید الکونین حضرت محمد مصطفٰے احمد مجتبٰے صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی متابعت کاملہ پر منحصر ہے جس فلسفی کی چشم بصیرت کو سرمۂ متابعت نبوی صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نورِ معرفت حاصل نہیں ہوا وہ اپنی کوتہ نظری کی بدولت عالمِ امر کی حقیقت ادراک کرنے سے بھی قاصر ہے چہ جائیکہ واجب الوجود تعالٰی و تقدس کی بارگاہ عظمت میں باریاب ہو سکے۔ اس کی نظر عالم خلق کی کائنات دیکھنے تک محدود ہے اور لطف یہ کہ عالم خلق کے متعلق بھی اسکی معرفت ناقص واقع ہوئی ہے۔ جواہر خمسہ[1] جنکا بیان فلاسفہ نے کیا ہے سب کے سب عالم خلق میں داخل ہیں۔ نفس ناطقہ اور عقل کو مجردات سے سمجھنا نقصِ معرفت پر مبنی ہے۔ نفس ناطقہ یہی نفس امّارہ ہے جس کو اصلاح اور تزکیہ کی سخت ضرورت ہے وہ بالطبع پست ہمت اور امور رذیلہ کیطرف مائل ہے عالم امر سے اس کو ہرگز تعلق نہیں اور کسی طرح بھی اس کو مجردات میں شمار کرنا صحیح نہیں عقل کی یہ کیفیت ہے کہ وہ صرف اُن معقولات کا ادراک کر سکتی ہے جن کو کسی نہ کسی طرح محسوسات سے گونہ

---

[1] جیسے کہ ہم پہلے کسی ذیلی حاشیہ میں لکھ چکے ہیں کائنات کی دو بڑی بڑی قسمیں ہیں (۱) جو حواس خمسہ کے دائرہ ادراک سے خارج ہیں منجملہ ان کے روح اور ملائکہ ہیں (۲) جنکا ادراک انہی حواس خمسہ ظاہری سے ہوتا ہے حیوانات نباتات سورج چاند وغیرہ اشیا اسی قسم سے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلے قسم کی اشیا مادہ سے مبرا ہیں اسلئے انکو مجردات اور موخر الذکر کو مادیات کہتے ہیں۔ حکماء اور فلاسفہ نے اسی لحاظ سے عالم کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ عالم مادیات اور عالم مجردات لیکن اہل تصوف و عرفان اول الذکر کو عالم شہادت۔ عالم جسمانیات۔ عالم ملک اور عالم خلق کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں اور دوسرے کو عالم غیب۔ عالم روحانیات۔ عالم ملکوت۔ اور عالم امر کہتے ہیں امام صاحب کا مطلب ہے کہ اگرچہ فلاسفہ نے ان دونوں عالموں کا اثبات کیا ہے اور یہ اثبات اجمالی طور پر بالکل درست ہے لیکن دونوں کے متعلق ان کی تفصیلی معرفت بہت کچھ ناقص ثابت ہوئی ہے۔

[2] حکماء یونان کے ہاں جواہر خمسہ یہ ہیں۔ ہیولےٰ۔ صورت (نوعیہ یا جسمیہ) جسم۔ نفس ناطقہ۔ عقل۔ ان جواہر کی تعریف اور تشریح یونانی فلسفہ میں موجود ہے یہاں اسقدر بسط و تفصیل کی گنجائش نہیں۔ مختصر آیہ کہ یونان

مناسبت اور مشابہت ہو اور جو حکماً دائرہ محسوسات میں داخل ہوں لیکن جن امور کی تشبیہ اور مثال مشاہدات اور محسوسات میں موجود نہیں عقل اوسکا ادراک کرنے سے قاصر ہے اور وہی چیز اسکے حق میں معمائے لاینحل ہو جاتی ہے اسلئے عقلِ انسان امورِ بے چون و بے چگون کے ادراک سے بالکل عاجز ہے اور "غیبِ محض" اشیا اسکی تیز بین نظروں سے محجوب رہتی ہیں۔ یہ اس بات کی ایک پختہ علامت ہے کہ وہ عالم امر سے نہیں۔ عالم امر سراسر بیچون و بےچگوں ہے۔ عالم امر کی ابتدا قلب سے ہوتی ہے۔ اسکے بعد بالترتیب روح سِرّ۔ خفی اور اخفےٰ کا مرتبہ ہے۔ یہ پانچوں لطائفِ انسانی[1] "عالم امر" سے ہیں اور درحقیقت انہی کو جواہر خمسہ کہنا بجا و زیبا ہے۔ یہی تو ان لوگونکی کوتہ نظری ہے کہ چند خزف پاروںکو جواہر بیش بہا خیال کئے ہوئے ہیں۔ عالم امر کے جواہر خمسہ کے حقائق ادراک کرنا آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کامل پیرونکی خصوصیت ہے۔ چونکہ اہل معرفت کہتے ہیں یہ ایک مسلم بات ہے کہ انسان عالم صغیر[2] ہے جسمیں عالم کبیر کی ہر ایک چیز کا نمونہ ودیعت رکھا گیا ہے اس بنا پر ان جواہر خمسہ کے انسان میں موجود ہونے سے یہ استدلال کرنا بالکل درست ہے کہ عالم کبیر میں بھی انہی جواہر کی اصل موجود ہو۔ چنانچہ عالم کبیر کے جواہر خمسہ کا پہلا جوہر عرش مجید ہے جیسے کہ عالم صغیر (انسان) میں پہلا جوہر قلب ہے، اور اسی مناسبت کی وجہ سے قلب کو عرش آلٰہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ باقی جواہر چارگانہ عرش مجید سے بھی بالاتر واقع ہوئے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح قلب انسانی عالم صغیر (وجود انسان) میں عالم خلق اور عالم امر کے درمیان بطور برزخ[3] واقع ہوا ہے اسی طرح عالم کبیر میں عرش مجید عالم خلق اور عالم امر کا برزخ ہے۔ قلب اور عرش اگرچہ عالم خلق میں نمودار ہوئے ہیں لیکن پھر بھی وہ عالم امر میں شمار

---

[1] انسان کے باطن میں جو پانچ جواہر عالم امر کے موجود ہیں ان کو لطائف خمسہ یا لطائف انسانی کہتے ہیں۔

[2] عالم صغیر کہنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ تمام عالم کے بڑے بڑے مختلف انواع واقسام کا نمونہ اس میں موجود ہے اور اسلئے حضرت انسان بھی گویا بجائے خود ایک عالم ہے۔

[3] برزخ اس چیز کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو اور دونوں سے مشابہت رکھتی ہو چنانچہ غضروف (کرکری ہڈی) گوشت اور اصل ہڈی کے درمیان بطور برزخ واقع ہوئی ہے اور جس کو دونسے

کئے جانے کے قابل ہیں اور بے چون و بے چگون ہونے کی صفت سے معرا نہیں۔ ان جواہر خمسہ کی کنہ حقیقت تک انہی کاملانِ طریقت کو رسائی حاصل ہوتی ہے جنہوں نے منازل و مراتب سلوک کو تفصیل وار طے کر لیا ہے اور سب سے آگے گذر کر نہایت النہایات تک پہونچ گئے ہیں۔ یہ ایک ناقص و خام کا کام نہیں ؎ ہر گدائے مرد میداں کے شود ٭ پشۂ آخر سلیماں کے شود [1] اگر خداوند پاک جل و علا کا فضلِ عظیم کسی بلند اقبال عارف کی چشمِ بصیرت کو کھول دے اور اپنی بساط کے موافق "مرتبۂ وجوب [2]" کے تفصیلی حقائق اسکے باطن میں جلوہ گر ہوں تو اُسے معلوم ہو جائے کہ وہاں ان جواہر کے اصل الاصول موجود ہیں اور عالم صغیر و کبیر کے جواہر اُن جواہر حقیقیہ کے مقابلہ میں عکوس و ظلال کہلانے کے قابل ہیں۔ ؎ این کار دولت است کنوں تا کرا رسد (یہ سعادت کا کام ہے۔ نہ معلوم کون اس سے بہرہ ور ہو) ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔ عالم امر کے حقائق کا اظہار کرنے میں سب سے بڑی یہ مشکل حائل ہے کہ یہ علوم و معارف نہایت دقیق اور عسیر الفہم ہیں۔ نہ معلوم کوتہ نظر اور ناحقیقت شناس اون کو کن معانی پر محمول کرینگے۔ یہ معارف علمائے راسخین سے مخصوص ہیں وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا [3] ؏ هَنِيئًا لِأَرْبَابِ النَّعِيمِ نَعِيمُهَا [4] ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ٭ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست [5]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مناسبت حاصل ہے۔ عام طور پر انسان جس حالت میں موت کے بعد قیامت تک رہتا ہے اس کو عالم برزخ کہتے ہیں۔ وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔ اس حالت میں نہ تو وہ دنیا میں ہوتا ہے اور نہ آخرت میں بلکہ ایک درمیانی حالت میں ہوتا ہے جس کو فی الجملہ دونوں حالتوں سے مشابہت ہے۔

[1] ہر ایک گدا کب مرد میدان بن سکتا ہے۔ بھلا آخر یہ کب ممکن ہے کہ مچھر کو سلیمان علیہ السلام ایسے باشان و شوکت فرمان روا کا درجہ حاصل ہو۔

[2] مرتبہ وجوب سے ہمیشہ ذات و صفات الٰہی تعالےٰ و تقدس مراد لئے جاتے ہیں۔

[3] تمہیں جو کچھ بھی علم دیا گیا ہے وہ علم الٰہی کے مقابلہ میں بہت قلیل ہے۔

[4] صاحبان نعمت کو ان کی نعمت مبارک ہو۔

[5] یہ مصلحت وقت نہیں کہ راز کی بات طشت از بام ہو جائے ورنہ کونسی خبر ہے جس کی بابت مے نوشوں کی مجلس میں معلوم نہیں۔

والسلام علیکم و علٰے من اتبع الہدٰے والتزم متابعۃ المصطفٰے صلے اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم۔

ثانیاً دل میں القاء ہوا کہ ان جواہر مقدسۂ علیا (جو عالم امر کے اصل الاصول ہیں) کا بھی کسی قدر حال بیان کردوں۔ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ان جواہر کی ابتدا صفاتِ اضافیہ[1] سے ہوتی ہے جو "مرتبۂ وجوب" اور "مرتبۂ امکان" کے درمیان بمنزلہ برزخ کے واقع ہیں۔ ان صفات سے بالاتر صفاتِ حقیقیہ کا مرتبہ ہے جنکی تجلیات سے روح کو شرف حاصل ہوتا ہے۔ قلب کا تعلق صفاتِ اضافیہ سے ہے اور انہی صفات کی تجلیات سے وہ مشرف ہوا کرتا ہے۔ باقی ماندہ جواہر علیائے ثلاثہ (سر خفی۔ اخفٰے) کا مرتبہ صفات حقیقیہ سے بھی بالاتر اور حضرت کبریائے ذات تعالٰے و تقدس کے دائرہ میں داخل ہے۔ اسی وجہ سے ان مراتب ثلٰثہ کی تجلیات کو تجلیات ذاتیہ کہتے ہیں جن کے متعلق لب کشائی کرنا خلافِ مصلحت ہے ۔ قلم ایں جارسید و سر بشکست۔ (قلم یہاں پہنچکر ٹوٹ گیا)

پندرھواں مکتوب (۳۵)

(ملا حاجی محمد لاہوری کے نام لکھا گیا)

{محبت ذاتیہ کا بیان۔ محبت ذاتیہ میں انعام وایلام برابر ہوتا ہے}

خداوند پاک جلّ و علا آں حضرت صلے اللہ تعالٰے علیہ وسلم کے طفیل سے ہمیں کثرت نظری

---

[1] علم کلام میں مفصل بیان کیا گیا ہے کہ حق جلّ و علا کی صفات مقدسہ کی دو قسمیں ہیں (۱) صفات ذاتیہ یا حقیقیہ۔ (۲) صفات اضافیہ جن صفات کو مخلوق سے تعلق ہے اور جن کا ظہور مخلوق کے وجود پر موقوف ہے جیسے احیا و اماتت رزق و شفا وغیرہ وغیرہ ان کو صفات اضافیہ کہتے ہیں کیونکہ ..... ان کی اضافت یعنی نسبت مخلوق کی طرف ہوتی ہے۔ صفات ذاتیہ حسب ذیل ہیں: حیات۔ علم۔ قدرت۔ ارادہ۔ سمع۔ بصر۔ کلام۔ صفت تکوین (ایجاد) کے ذاتی یا اضافی ہونے میں اختلاف ہے۔ امام صاحب کے نزدیک اس کا صفت ذاتیہ ہونا راجح ہے اور اسلئے عموماً اپنے مکتوبات میں صفات ذاتیہ مذکورہ بالا کو صفات ثمانیہ سے تعبیر فرماتے ہیں۔ چونکہ صفات آلہی کی بحث نہایت دقیق اور خطرناک ہے اسلئے یہاں زیادہ تفصیل کرنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ "مرتبہ وجوب" سے ذات و صفات آلہی تعالٰے و تقدس اور "مرتبۂ امکان" سے دیگر مخلوقات مراد ہے۔

اور کج فہمی سے محفوظ رکھے۔ سیر[1] و سلوکِ طریقت کا مقصود یہہ ہے کہ نفس امارہ کا
تزکیہ[2] و تطہیر ہو جائے۔ نفس کو آلہہ باطلہ کی پرستش اور گرفتاری سے مخلصی حاصل ہو جس کی
بنا ہوائے نفسانی پر ہے۔ ایک ہی معبودِ حق تعالےٰ و تقدس قبلۂ توجہ رہجائے اور کسی دینی
یا دنیاوی مطلب کو کسی طرح اُسپر ترجیح نہ دے۔ اگرچہ زمرۂ ابرار[3] کے اعمال کے لحاظ
سے مقاصدِ دینیہ حسنات کی فہرست میں داخل ہیں لیکن مقربین کے نزدیک یہ سیئات
میں شمار ہوتے ہیں اور وہ ایک ہی ذاتِ حق تعالےٰ و تقدس کے سوا کسی اور مطلب کو
اپنا قبلۂ توجہ یا مطمحِ نظر نہیں قرار دیتے۔ اس دولت عظمےٰ سے بہرہ ور ہونا مقامِ فنا اور
محبت ذاتیہ کے حصول پر موقوف ہے۔ سالک اس مقام پر پہونچکر نعمت اور عذاب کو ایک ہی
نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ تعذیب سے اُسے وہی لذت حاصل ہوتی ہے جو ایصالِ نعمت کی حالت
میں متصور ہے۔ اس قسم کا عارف اگر بہشت کی تمنا کرتا ہے تو صرف اسلئے کہ وہ رضائے
الٰہی تعالےٰ و تقدس کا مظہر ہے اور اُسکا طلب کرنا خداوند پاک جلّ و علا کی مرضی کے
عین مطابق ہے۔ دوزخ سے بچنے کی بھی اسلئے خواہش کرتا ہے کہ مولائے پاک تبارک و تعالےٰ
کے قہر و غضب کی جگہ ہے۔ درحقیقت نہ اس کو بہشت سے کچھ سروکار ہے اور نہ دوزخ سے وہ
بہشت کو اسلئے نہیں چاہتا کہ اوسمیں داخل ہو کر حظوظ نفسانیہ سے متمتع ہو اور نہ دوزخ
سے اس بنا پر پرہیز کرتا ہے کہ وہاں جاکر رنج و عذاب میں مبتلا ہونا ہے۔ ان بزرگوار اولیا
کے نزدیک جو کچھ بھی محبوب حقیقی کی طرف سے پہونچے (نعمت ہو یا نقمت۔ رنج ہو یا راحت)

---

[1] کسی کامل مردِ راہ کے زیرِ تربیت تصوف و عرفان کے منازل و مقامات میں تدریج ترقی کرنے کو مجازاً سیر و سلوک کہتے ہیں اصلی معنے ان لفظوں کے راہ پر چلنا ہے۔ حقیقی اور مجازی معنوں میں وجہ مناسبت کی بالکل ظاہر ہے۔

[2] نفس کو بُری خصلتوں اور مذموم اوصاف سے پاک کرنے کا نام تزکیہ ہے۔

[3] آخرت میں نجات پانے والے گروہ کے دو بڑے بڑے فرقے ہیں (۱) ابرار (۲) مقربین عام نیکوکاروں کو ابرار اور درجات قرب پر فائز ہونے والے اصحاب کو مقربین کہتے ہیں۔ ان کا ذکر کسی گذشتہ مکتوب میں ہو چکا ہے۔ اسی طرح یہ بھی مفصل بیان کیا گیا ہے کہ ابرار کے حسنات مقربین کے نزدیک سیئات کا حکم رکھتے ہیں۔ اسی موقعہ پر ذیلی حاشیہ میں یہ توضیح کر دیگئی ہے کہ کس طرح ایک شخص کا حسنہ دوسرے کے حق میں سیئہ ہو سکتا ہے۔

وہی مرغوب اور عین مطلوب ہے کل ما یفعل المحبوب محبوب۔ ہرچہ از دوست نیکو است۔ اخلاص کی حقیقت اسی مقام پر سالک کو میسر ہوتی اور آزار بلا سے اسی رتبہ پر فائز ہو کر خلاصی نصیب ہوتی ہے۔ کلمۂ توحید کا کہنا اسی حالت میں قال مطابق حال کا مصداق ہوتا ہے۔ اس کے بغیر گوہر مقصود کا ہاتھ آنا نہایت دشوار ہے۔ جبتک محبت ذاتیہ حاصل نہو جس میں اسماء و صفات کچھ بھی ملحوظ نہوں اور محبوب کی تنعیم یا تعذیب پر مطلق التفات نکیا جائے (بلکہ محبوب کے انعام و ایلام کو یکساں طور پر طیب خاطر سے قبول کرے اور خواہ وہ محبوب کسی اسم یا صفت میں جلوہ گر ہو اس کی محبت میں کچھ بھی فرق نہ آئے) تب تک معاملہ ناقص اور مغشوش رہتا ہے۔ اس شرکت سوز محبت کے بغیر فنائے مطلق کا حاصل ہونا محال ہے ؎

عشق آں شعلہ است چوں بر فروخت ٭ ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت[1]
تیغ لا در قتل غیر حق براند ٭ در نگر زاں پس کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ٭ شاد باش اے عشق شرکت سوز زفت

سولہواں مکتوب (۳۶)

(ملا حاجی محمد لاہوری کے نام لکھا گیا)

(شریعت تمام دنیا و آخرت کی سعادتوں کا سرچشمہ ہے۔ طریقت اور حقیقت بھی شریعت کے خادم ہیں)

خداوند پاک جل و علا ہمیں شریعت مصطفویہ کی حقیقت سے بہرہ ور فرمائے

[1] عشق وہ شعلہ سوزندہ ہے کہ جب وہ بھڑک اٹھتا ہے تو سوائے محبوب کے سب اشیا کو بھسم کر ڈالتا ہی (محب صادق) حرف نفی کی تلوار لیکر غیر اللہ تعالے و تقدس کو عدم آباد پہونچا دیتا ہے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ اسکے بعد اور کیا رہگیا۔ ایک خدائے برحق جل و علا تو باقی رہ (جس کا الا اللہ سے اثبات کیا جاتا ہے) دوسری تمام اشیا کا فور ہو گئیں۔ شرکت کو جلا دینے والے مضبوط اور مستحکم عشق! تم پر آفریں ہو کہ تیری بدولت ہمیں غیر اللہ کی گرفتاری سے خلاصی پائی)

علےٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ؎ ویرحم اللہ عبدا قال امینا۔ (خدائے پاک اس نیکدل ہمدرد بندہ پر بھی رحم فرمائے جس نے ہمارا ساتھ دیکر اس دعا کی اجابت کیلئے آمین کہدیا) شریعت نبویہ علےٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ تین بڑے بڑے اجزا پر مشتمل ہے۔ علم۔ عمل۔ اخلاص۔ جب تک یہ تینوں اجزا حاصل نہوں شریعت کا کمال حاصل ہونا ناممکن ہے۔ شریعت کو انتہائے کمال تک پہونچانے سے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی حاصل ہوتی ہے جو تمام دنیا اور آخرت کی سعادتوں سے اعلےٰ وافضل اور بالاتر وبرتر واقع ہوئی ہے۔ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ (خدائے پاک کی خوشنودی حاصل ہونا سب نعمتوں سے بڑھکر ہے) اس تقریر سے آپ کو صاف ثابت ہوگیا کہ دنیا اور آخرت کی کوئی سعادت نہیں جس کے حصول کیلئے شریعت مقدسہ کفیل نہو اور کوئی ایسا مطلب ومقصود نہیں جو شریعت کو چھوڑکر کسی دوسرے ذریعہ حاصل ہو۔ طریقت اور حقیقت جو صوفیۂ کرام قدس اللہ اسرارہم کا ممتاز اصول ہے دونو شریعت ہی کے خادم اور اسکے جزو ثالث (اخلاص) کی تکمیل کے وسائل ہیں۔ ان دونوں میں مشغول ہونے کا مدعا صرف اسی قدر ہے کہ شریعت کی تکمیل ہو۔ شریعت کے علاوہ کوئی مقصود مدنظر نہیں۔ احوال ومواجید اور علوم ومعارف جو سالکانِ تصوف کو اثنائے راہ سلوک میں حاصل ہوتے ہیں انکا حاصل ہونا مقصود اصلی نہیں۔ بل اوہامٌ وخیالاتٌ تربیٰ بہا اطفال الطریقۃ (بلکہ یہ باتیں توہم وخیال سے بڑھکر کچھ بھی وقعت نہیں رکھتیں۔ یہ تو اطفال طریقت کی تربیت اور دل بہلانے کے سامان ہیں) ان تمام امورِ غیر مقصودہ سے گذر کر مقام رضا تک جو اصل مقصود ہے اور سلوک وجذبہ کے مقامات کا منتہےٰ واقع ہوا ہے پہونچ جانا چاہیئے۔ تمام منازل ومراحلِ طریقت اور حقیقت کو طے

کرنے سے یہی مطلوب ہے کہ مقام اخلاص حاصل ہو جس کے ساتھ مقام رضا کا حاصل ہونا لازم ہے۔ ہزاروں سالکانِ طریقت ہیں کوئی ایک آدھ ایسا خوش نصیب ہوتا ہے کہ ہر سہ تجلیات (تجلئ افعال۔ تجلئ صفات۔ تجلئ ذات) اور عارفانہ مشاہدات سے اُس کو آگے بڑھا کر مقام اخلاص و رضا تک پہونچا دیا جائے۔ کوتہ خیال متصوفین احوال و مواجید کو مقصود بالذات خیال کئے ہوئے ہیں اور مشاہدات و تجلیات کو مطالب اصلیہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اوہام و خیالات کے زندان میں محبوس رہکر کمالات شریعت سے (جو حقیقت مطالب اصلیہ ہیں) محروم رہجاتے ہیں۔ کَبُرَ عَلَے الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ط اَللّٰهُ يَجْتَبِیْ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِیْ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ط (جس بات کی طرف تو بلاتا ہے وہ مشرکوں پر نہایت شاق گذرتی ہے۔ خداوند پاک جل وعلا جس کو چاہتا ہے اپنی ہاں برگزیدہ بنا لیتا ہے اور جو کوئی اسکی طرف رجوع کرے خداوند پاک جل وعلا اس کو ہدایت بخشتا ہے) ہاں یہ مسلم ہے کہ مقام اخلاص کا حاصل ہونا اور رضا کے جلیل القدر مرتبہ تک واصل ہونا انہی احوال و مواجید اور علوم و معارف کے حصول پر منحصر ہے۔ لہذا یہ سچ ہے کہ وہ مطلوب اصلی کے ذرائع اور وسائل ہیں لیکن خود مقصود بالذات نہیں۔ یہ حقیقت پورے دس سال کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے طفیل سے مجھ ناکارہ پر منکشف ہوئی اور شریعت کے اصلی حسن و جمال نے اپنا جلوہ دکھایا گو مجھے پہلے ہی احوال و مواجید سے چنداں دلبستگی نہیں تھی اور ہمیشہ یہی مطلب میرے پیش نظر رہتا تھا کہ حقیقت شریعت تک رسائی ہو لیکن اصلی حقیقت کا انکشاف پورے دس سال کے بعد ظہور میں آیا۔ والحمد للّٰہ تعالےٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ میاں شیخ جمال کا گزر جانا عالم بقا ہوتا تمام اہل اسلام کیلئے موجب اندوہ و ملال ہے اس کے صاحبزادوں کو میری جانب سے تعزیت اور فاتحہ خوانی کر دیجئے۔ والسلام۔

سترھواں مکتوب (۷۰)

(شیخ چتری کے نام لکھا گیا)

(اتباع سنت نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی ترغیب۔ طریقہ نقشبندیہ کی نسبت حاصل کرنیکی تشویق)

آپکا گرامی نامہ جو آپ کی عنایت کا ثبوت تھا موصول ہو کر کمال مسرت وابتہاج کا باعث ہوا۔ آپنے طریقہ علیہ نقشبندیہ پر ثابت قدم اور مستقیم رہنے کے متعلق لکھا تھا۔ الحمد للہ سبحانہ وتعالےٰ علےٰ ذٰلک حق سبحانہ وتعالےٰ اسی طریقہ علیہ کے بزرگوارونکی برکت سے آپکو بے انتہا ترقیات عنایت فرمائے ان بزرگوارونکا طریقہ اکسیر اعظم ہے جسکی بنا سنت نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی متابعت پر رکھی گئی ہے۔ میری اپنی یہ حالت ہے کہ مدتہائے دراز تک علوم ومعارف اور احوال ومواجید مجھ پر موسلا دھار بارش کیطرح برستے رہے اور جو کچھ بھی راہ سلوک وتصوف میں میسر ہوتا ہے خداوند پاک جل وعلا کے فضل وکرم سے حاصل ہوا لیکن موجودہ حالت میں بجز اس کے اور کوئی آرزو باقی نہیں رہی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی کسی مردہ سنت کو زندہ کروں اور احوال ومواجید سے ارباب ذوق ہی کو متمتع ہونے دوں۔ آپ کو چاہئے کہ اپنے باطن کو تو نسبت خواجگان نقشبندیہ قدس اللہ تعالےٰ اسرارہم سے معمور رکھیں اور ظاہر کو ہر ایک طرح سے سنن نبویہ علےٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کامل اتباع سے آراستہ کریں ؎ کار این است غیر ایں ہمہ ہیچ " پانچوں نمازوں کو وقت کے پہلے حصہ میں ادا کیا کریں لیکن سردیوں میں عشا کی نماز کو تہائی رات کے گذرنے تک مؤخر کرنا افضل اور مستحب ہے۔ میں اس بارہ میں مجبور رہوں۔ یہ نہیں چاہتا کہ نماز کے ادا کرنے میں ذرہ بھی تاخیر واقع ہو۔ ہاں عوارض بشریہ اور انسانی کمزوریاں ہر حالت میں قابل استثنا ہیں۔ فقط